بے شہر کا خواب
پرویز شہریار

اسے گھر کے اندر گرمی کی ضرورت تھی۔ لیکن بیوی بیٹی کی حد سے بڑھی ہوئی بے اعتنائی اور لاتعلقی نے اسے چڑچڑا بنا دیا تھا۔ اور پھر ایک روز، رات کی کپکپاتی ہوئی سردی نے اُسے شراب خانے کے دروازے تک پہنچا دیا۔ شراب نے اس کے بدن میں گرمی اور نشے نے بے خودی جگا دی، یوں غم غلط کرنے کے اس سہارے نے اس کی زندگی کو دوسری ڈگر پر ڈال دیا۔ مے خانے سے شناسائی نے اس کی زندگی کے دس پندرہ برس چرا لیے۔

(جرم ضعیفی کی سزا)

یہاں ہر من واسنا پلتی ہے، یہاں ایک رات میں محبت جوان ہوتی ہے اور صبح ہونے سے پہلے دم توڑ دیتی ہے، جہاں جسم کا ملن ہوتا ہے روح تو پیاسی ہی رہ جاتی ہے۔ غرض کہ تم یاد کرو، کتنے اداس رہنے لگتے تھے تم، تمہاری اداسی کتنی طویل تھی، کتنی نسلیں اداس رہیں، جانتے ہو تم؟

کرشن! اگر تم اسی طرح اداس رہے تو ساری دنیا اداس ہو کر فنا کے غار میں اتر جائے گی ایک دن۔ آؤ کرشن! واپس چلو۔

(کرشن — کھوئے یگ کی جستجو)

"... ان پندرہ کروڑ انسانوں کی زبانیں کاٹ کر خاک میں ملا دے تاکہ وہ اپنی بے باکی اور حق گوئی کا مزہ چکھ لیں۔" اس نے شدت جذبات سے اپنی مٹھیاں بھینچتے ہوئے مزید کہا، "اور وہ ہمیشہ کے لیے گونگے ہو کر رہ جائیں اور کبھی اپنے بے ہودہ حقوق کا مطالبہ مجھ سے نہ کر سکیں۔"

(میرے طوفان یم بہ یم)

دفعتاً پُل کے اوپر سے چیختی، چنگھاڑتی، شور مچاتی ریل گاڑی تیزی سے گزر جاتی ہے۔ میں دم بھر کو بڑی حسرت سے اسے دیکھتا رہ جاتا ہوں، سوچتا ہوں مجھ میں اور ریل گاڑی میں کتنی مسابقت ہے۔ میں پہاڑ جنگل گاؤں میں تھا جب بھی یہ اتنی ہی تیزی سے گزرتی تھی بلکہ ان دنوں زیادہ تیز رفتار تھی۔

(جولان گاہ کی حد)

بڑے شہر کا خواب

(افسانوی مجموعہ)

پرویز شہریار

تقسیم کار

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

کتاب کا نام : بڑے شہر کا خواب
مصنف و ناشر : پرویز شہریار
طابع : عفیف پرنٹرس، دہلی
پہلی اشاعت : 2006
تعداد اشاعت : 400
لیزر ٹائپ سیٹنگ : موسیٰ رضا
تزئین و ترتیب : خالدہ تبسم
آرٹ اور سرورق : بپلب کنڈو
مغیث احمد

ملنے کے پتے :
- IV/48، این آئی ای کیمپس، این سی ای آر ٹی کیمپس، شری اروندو مارگ، نئی دہلی 110016
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025
- انجمن ترقی اردو، اردو گھر، راؤز اوینو، نئی دہلی 110002

زیر اہتمام : محمد مجتبیٰ خان

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

3108، گلی عزیز الدین وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی - 110006 (انڈیا)

BADE SHAHAR KA KHWAB
(The anthology of short stories of Parvez Shahryar)

2006
ISBN : 81-8223-168-X

Rs. 125.00

والدہ مرحومہ شافیعہ خاتون کے نام

جنھوں نے

۱۶/جنوری ۱۹۹۶ء

کی انتہائی صبر آزما رات میں

اس دارفانی کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ دیا

اللہ مغفرت فرمائے (آمین)

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا

تم ہی سو گئے داستاں کہتے کہتے

یہ کتاب دہلی اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔

افسانہ نگار کا مختصر تعارف

سیّد پرویز احمد ولد شہاب قاضی پوری، قلمی نام پرویز شہریار، تاریخ پیدائش ۱۰رجنوری ۱۹۶۴، جائے پیدائش جمشید پور، وطن قاضی پور (شاہ آباد)اور موجودہ سکونت نئی دہلی میں ہے۔

انھوں نے آر۔ ڈی۔ ٹاٹا ہائی اسکول سے میٹرک فرسٹ ڈویزن سے پاس کیا۔ جمشید پور کوآپریٹیو کالج (رانچی یونیورسٹی) سے آئی۔ ایس۔ سی۔ (ریاضی) کی اور بی۔ اے (انگریزی آنرز) کی ڈگری فرسٹ ڈویزن سے حاصل کی۔ ۱۹۹۱ میں ایم۔ اے (اردو) کی ڈگری جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی سے امتیازی نمبروں سے حاصل کی اور یونیورسٹی میں اوّل آئے۔ اس پر دہلی اردو اکادمی اور جواہر لال نہرو میموریل سوسائٹی، نئی دہلی نے انعام و اسناد سے نوازا گیا۔ ۱۹۹۳ میں ان کے تحقیقی مقالہ ''منٹو اور عصمت کے یہاں عورت کا تصور'' پر جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے انھیں ایم۔ فل کی ڈگری تفویض کی گئی۔ فی الحال، دہلی یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری کے لیے ''راجندر سنگھ بیدی کے افسانوی ادب کا تنقیدی مطالعہ'' کے موضوع پر ریسرچ کررہے ہیں۔

انھوں نے پروفیشنل تعلیم کے صیغے میں ترقی اردو بیورو، نئی دہلی سے خطاطی کا ڈپلوما حاصل کیا۔ ماس میڈیا کا ایڈوانس ڈپلوما انھیں جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے ۱۹۹۱ء میں ملا۔ انھوں نے پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما اِن بُک پبلیشنگ (اسپشلائزیشن ان ایڈیٹنگ) کا دو سالہ کورس ۱۹۹۵ء میں دہلی یونیورسٹی سے پاس کیا، یونیورسٹی میں

اول مقام حاصل کیا اور دہلی یونیورسٹی نے ان کے تحقیقی مقالہ ''اردو لیزر ٹائپ سیٹنگ: اِٹس پرابلمز اینڈ چیلنجز اِن بک پبلیشنگ انڈسٹری اِن انڈیا'' پر انھیں گولڈ میڈلسٹ کی سند سے سرفراز کیا۔

۱۹۹۳ سے نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ میں اسسٹنٹ ایڈیٹر (اردو) کی حیثیت سے اپنا کیریئر شروع کیا اور ۱۹۹۷ سے ۲۰۰۵ تک انچارج اردو کی حیثیت سے اور ۲۰۰۵ سے ایڈیٹر کی حیثیت سے پبلی کیشن ڈویژن میں خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اب تک تقریباً ۲۰۰ نصابی اور معاون درسی کتابوں نیز پریکٹیکل مینوئل کی ادارت کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ این سی ای آر ٹی کی نصابی کتابوں اور معان درسی کتابوں کے انگریزی سے اردو میں ترجمے بھی کیے ہیں۔ ثانوی اور اعلا ثانوی سطح کی انگریزی کتابوں کی بھی ایڈیٹنگ کی ہیں۔

انھوں نے اپنی نوجوانی میں پہلا افسانہ ۱۹۸۰ میں لکھا جب وہ دسویں جماعت کے طالب علم تھے اور افسانے فن کی کسوٹی پر بالکل کھرا اُترا جو ''پندار'' پٹنہ کے ۶/ ستمبر ۱۹۸۰ کے شمارے میں ''چمبل کی دسویں رانی'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس طرح، آپ کے ادبی سفر کا آغاز ۱۹۸۰ سے ہوتا ہے۔ شروع میں، جدیدیت کے رجحان سے بھی اثرات قبول کیے اور چند ایک علامتی اور تجریدی افسانے بھی لکھے۔ ''قوس'' کے ایک خصوصی شمارہ ''نیا افسانہ، کچھ نئے نام'' میں مختصر تعارف کے ساتھ ایک علامتی افسانہ ''نئی روشنی کا آخری ڈرامہ'' کے عنوان سے ۱۹۸۵ میں شائع ہوا۔ ۱۹۸۶ میں ''شب خون'' میں ''سایہ سایہ جنگل'' شائع ہوا تو شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا کہ پرویز شہریار جمشید پور کے نئے افسانہ نگار ہیں۔ لیکن جلد ہی افسانے میں کہانی پن، بیانیہ اور حقیقت نگاری کی فوقیت کے ادراک اور شعور سے واپسی کہانی کی پرانی ڈگر پر ہوگئی۔ بسلسلۂ تعلیم دلّی آنے پر آل انڈیا ریڈیو سے کچھ افسانے نشر ہوئے مثلاً ''پھول کا بوجھ'' اور اسی قبیل کے دیگر افسانے۔ ''بھولپن'' یعقوب عامر صاحب

نے ''یوجنا'' جیسے معاشی اور ترقیاتی رسالے میں شائع کردیا۔ غرضیکہ ادبی اور نیم ادبی رسائل میں افسانے شائع ہوتے رہے ہیں۔ ''شاعر'' اور ''کتاب نما'' میں ان کی نظمیں شائع ہوچکی ہیں۔ اس کے علاوہ، ''ایوان اردو'' اور ''اردو دنیا'' میں ان کے علمی اور ادبی مضامین اشاعت پذیر ہوکر مقبول عام ہوچکے ہیں۔

ادبی نشستوں میں افسانے پڑھے۔ ''ادارہ بزم'' جمشید پور کی نشستوں میں ''کفن چور'' اور اسی قسم کے دیگر مختصر ترین افسانے پڑھے۔ ''رفتار ادبی فورم'' جے این یو، کے جنرل سکریٹری شپ کے زمانے میں ایک افسانہ ''شیطان'' سامعین کے گوش گزار کیا۔ اردو اور ہندی زبان کا مشترکہ ادارہ ''سنگم ادبی فورم''، جے این یو میں بھی سکریٹری کی حیثیت سے ایک افسانہ ''کرشن۔کھوئے یگ کی جستجو'' پڑھا جس میں سامعین نے تبصرے بھی کیے اور مہمان خصوصی راجندر یادو ایڈیٹر ''ہنس'' (ہندی) نے بھی اظہار خیال کرتے ہوئے اسے کافی سراہا۔

ان کی ایک تحقیقی اور تنقیدی کتاب ''منٹو اور عصمت کے یہاں عورت کا تصور'' کمپوزنگ کے مرحلے میں ہے جس میں منٹو اور عصمت کے افسانوں میں عورت کے تصور کے حوالے سے نسوانی کرداروں کا فن اور سماجیاتی نقطہ نظر سے تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے یہ کتاب مارچ ۲۰۰۶ میں منظر عام پر آئے گی۔

زینت شہریار

(سابق آرٹ ٹیچر)

بھون ودیالیہ، چنڈی گڑھ، پنجاب

جلد ہی منظر عام پر آرہی ہے

مصنف کی دوسری تحقیقی و تنقیدی کتاب

منٹو اور عصمت کے یہاں عورت کا تصوّر

اس کتاب میں مصنف کے ذریعے سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کے سبھی نمائندہ افسانوں میں عورت کے تصور کے حوالے سے نسوانی کرداروں کا فن اور سماجیاتی نقطہ نظر سے انتہائی باریک بینی اور پوری ادبی دیانت داری کے ساتھ تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

"میں نے پرویز شہریار کے اس مقالے کو بہت شوق اور دلچسپی سے پڑھا۔ آپ نے اس مقالے کو بہت محنت سے تیار کیا ہے۔ آپ نے دونوں کے فن کا بہت اچھی طرح ایماندارانہ تجزیہ کیا ہے اور ان دونوں کے یہاں عورت کے تصور میں جو فرق ہے اُسے بھی بہت خوبی سے واضح کیا ہے۔"

پروفیسر صغرا مہدی

ترتیب

۱

جرمِ ضعیفی کی سزا

پچھلے کئی دِنوں سے میں ایک ناول لکھنے میں اُلجھا ہوا تھا۔ کل رات ناول ختم ہوا۔ بہت سوچنے کے باوجود، میں ناول کے ہیرو ——— ایک بڈھے کو بچا نہ سکا۔ آخر اُسے موت کی نیند سلا دیا۔ میں کیا کرتا، کہانی کی مانگ ہی کچھ ایسی تھی کہ اُس بڈھے کی موت یقینی ہوگئی تھی۔

ناول نگار تو محض شروع کرتا ہے۔ پھر تو کہانی خود اپنے آپ کو لکھواتی چلی جاتی ہے۔

''قصہ ایک بڈھے شخص کا تھا۔ جو ظاہر ہے کہ ہمیشہ سے بوڑھا نہیں تھا۔ البتہ فکر نے اُسے وقت سے پہلے بوڑھا بنا دیا تھا۔ سفید بال جا بجا جھریاں پڑی ہوئیں اور سپاٹ سا چہرہ۔ بات کرنے میں منہ سے تھوک کی چھینٹیں اڑتیں لیکن انتہائی رحم دل، اپنے دشمنوں کو بھی بڑی آسانی سے معاف کر دینا، اُس کی فطرت تھی۔ وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ سنجیدہ اور سادگی پسند تھا۔ وہ بڈھوں کی طرح سوچتا تھا ——— لیکن، ظاہر ہے وہ ہمیشہ سے بڈھا نہیں تھا۔ کبھی وہ بچہ تھا۔ بچے سے وہ جوان ہوا۔ اُس

نے بھی سپنے دیکھے تھے۔ اُس نے کوئی ستاروں سے اپنی محبوبہ کی مانگ سجانے کا خواب نہیں دیکھا تھا۔ نہ ہی چاند تاروں کو توڑ کے اپنی معشوقہ کے قدموں میں نچھاور کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے تو صرف ایک خوش حال کنبے کا خواب دیکھا تھا۔ ایک چھوٹا سا گھر ہو۔ ایک اچھی سی صحت مند اور خوش مزاج بیوی ہو۔ دو چھوٹے چھوٹے بچے ہوں جسے دیکھ کے وہ اپنے دُکھ بھول سکے۔ جو اُس کے بڑھاپے کا سہارا ہوں۔

بہرکیف! اسی تمہید کے ساتھ میں نے ناول لکھنا شروع کر دیا۔ میں اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا، پہروں سوچتا رہتا۔ کردار کیسا ہوگا۔ اُس کے مکالمے کیسے ہوں۔ واقعات کی ترتیب کیا ہوگی۔ اُن واقعات کے منطقی نتائج کیا ہونے چاہئیں۔ میں اِن ہی خیالات میں گم رہنے لگا۔ ایک ہاتھ میں کاغذ دوسرے ہاتھ میں قلم اور عینک ٹیبل پر رکھ کے میں سوچ میں گم ہو جاتا ہوں۔ سوچتے وقت میری آنکھیں خود بخود موند جاتیں۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے جب میری ٹانگیں دُکھنے لگتیں تو اُنھیں بالکنی کی ڈھائی تین فیٹ اونچی منڈیر سے ٹیک دیتا اور افکار کے آسمان پر اڑتا ہوا بہت دور خلاؤں میں سیر کرنے لگتا۔ فکر ایک کٹی پتنگ کی مانند ہوا میں ہچکولے کھاتی پھرتی اور میرے اندر کا ناول نگار کسی بالک کی طرح اُس کی طرف منہ اٹھائے دوڑا پھرتا۔ کبھی پتنگ قابو میں آجاتی تو جی خوش ہوتا اور ساری تھکن بھول جاتا۔ ورنہ ٹھوکریں کھاتا، کانٹے چبھاتا پتنگ کی چاہ میں ننگے پاؤں دوڑتا پھرتا۔

ایک دن عین اسی وقت جب میں سوچ میں گم تھا۔ دفعتاً کھڑ کھڑ پھڑ پھڑ کی آواز ہوئی۔ ہڑبڑا کے اٹھا تو پھڑ پھڑ کرتا ہوا ایک کبوتر جھروکے پر سے اڑ گیا۔ اڑتے ہوئے اُس کی چونچ سے کوئی تنکا گرا تھا۔ کرسی پر کھڑے ہو کر دیکھا تو وہاں جھروکے پر چند تنکے رکھے ہوئے تھے۔ مڑ کے دیکھا تو چھت کے کنگورہ سے کبوتری اپنی گردن لمبی کیے میری حرکتوں کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کی گول گول آنکھوں میں سرخی تیر رہی تھی ـــــ تب تک کبوتر دوسرا تنکا اُنہی چونچ میں لے کر آ گیا۔ میں سمجھ

گیا۔ اپنی جگہ پر واپس آیا اور خاموشی سے بیٹھا اُنھیں دیکھتا رہا ــــــ ایک ایک تنکا دونوں اپنی اپنی چونچ میں لاتے تھے اور اوپر تلے رکھتے جاتے تھے .....

دوسرے دن میرے ناول کا قصہ تیزی سے بڑھنے لگا۔ ناول کے ہیرو نے شادی کر لی تھی۔ اب وہ اپنے مکان میں اپنے تخیل کے مطابق ایک عمدہ ڈرائنگ روم سجاتا ہے۔ وہ سنگھار دان پر بڑے شوق سے اپنی شادی کی تصویر سجاتا ہے۔ جس میں اُس کی دھان پان سی دلہن اُس کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی۔ پیتل کے پالش کیے ہوئے گملوں میں منی پلانٹ کی لمبی نازک سی بیل کو ایک مضبوط لکڑی کے سہارے اوپر تک چڑھاتا ہے ــــــ اب وہ ہر وقت مگن رہتا ہے۔ وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ کام کی تھکن اُسے محسوس ہی نہیں ہوتی۔ اسے لگتا کہ وہ ابھی بہت دور جانے والا ہے۔ اِتوار کی چھٹی ہوتی تو وہ کسی پارک میں چلا جاتا۔ رات کا کھانا کسی بڑے ہوٹل میں کھاتا۔ بیوی اُسے اپنے ہاتھوں سے وہ کوٹ پہناتی تھی جو اسے سسرال سے ملی تھی ــــــ ایسے میں وہ خوشی سے سرشار ہو کر اپنی دھان پان سی بیوی کو گود میں اُٹھا کر جھوم سا جاتا تھا۔ وقت دبے پاؤں گزرتا رہا ــــــ پھر ایک دن بیوی نے چپکے سے شرماتے ہوئے کہا۔ ''میں ماں بننے والی ہوں۔'' اور پھر وہ دونوں خوشی اور ذمہ داری کے ملے جلے جذبے سے مغلوب ہو کر ..... ہونے والے بچے کی بابت دیر تک سوچتے رہے۔

گلابی جاڑے کے دن تھے۔ شام ہی سے سردی شروع ہو جاتی تھی۔ کبوتروں نے اپنا آشیانہ بنالیا تھا۔ اُس تنگ جگہ میں بھی دونوں ایک دوسرے کی گردن میں گردن حمائل کر کے پیار جتاتے، سکھ دکھ ساتھ نبھانے کا یقین اور اپنی قربت کا احساس دِلاتے رات کی ظلمت کو صبح کی سپیدی میں منتقل کر دیتے۔ مادہ انڈے سیتی تھی اور نر دور دَراز سے جا جا کر کے دانے چگ کر لایا کرتا تھا۔ زندگی ایک مقصد کی طرف گامزن تھی ــــــ

میرے ناول کا ہیرو تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ میں روزانہ جاڑے کی دھوپ میں بیٹھ کے جلدی جلدی ناول کے ابواب ختم کر رہا تھا۔ اب میرے ناول کا ہیرو ایک بچی کا باپ بن چکا تھا۔ وہ بچی سنِ بلوغ کو پہنچ چکی تھی۔ لیکن نقوش ابھی پتلے تھے جیسے جوانی کی برفیلی چٹانوں پر چڑھنا چاہتی ہے لیکن برف پگھل پگھل جاتی تھی اور اُس کے پاؤں اُن پر نہیں جم رہے تھے ـــــ البتہ ناول کے ہیرو کی بیوی کا جوبن اب تک قائم تھا۔ اس کے اندر ایک جوالا تھا جو پھٹ پڑنا چاہتا تھا۔ قدرت کا نظام بھی عجیب ہے کون جانتا تھا کہ ایک بظاہر بے ضرر سی زمین کے نیچے قیامت خیز آتش فشاں چھپا ہوا تھا۔

میرے ناول کا ہیرو جب دودھ سے بھری مرکھنی گائے کو دیکھتا تو اُس کی لاچاری کا احساس شدید ہو جاتا ـــــ

ایک دن، میں خیالوں میں گم تھا۔ اچانک میری نظر جھروکے پر پڑی، تو دیکھا کہ کبوتر بار بار اُڑ کے آشیانے پر بیٹھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن کبوتری اُسے ہر بار اپنی چونچ سے مار کر اُڑا دیتی ہے۔ وہ بے چینی سے کبھی کنگورے پر بیٹھتا ہے۔ کبھی اِدھر سے اُڑ کے اُدھر چلا جاتا ہے۔ اُس کے سمٹے سمٹائے پروں سے لگتا ہے گویا وہ خود کو بہت لُنڈ مُنڈ محسوس کرتا ہے۔ اُس کی نظر ہر پھر کر اُسی کبوتری پر ٹک جاتی ہے۔ اور کبوتری غصے میں بار بار آشیانہ کے تنکوں پر ٹھونگے مارتی ہے ایک ڈراؤنی سی غٹرغوں غٹرغوں کی آواز کے ساتھ ـــــ۔ بات میری سمجھ میں نہ آئی۔

اُس رات جب میں ناول لکھنے بیٹھا تو مجھے بہت افسوس ہوا کیوں کہ میرے ناول کے ہیرو کو کمپنی سے نکال دیا گیا تھا۔ اس لیے کہ وہ ٹھیک وقت پر کام پر نہیں جاتا تھا۔ اِس غم سے وہ تنہا ہی جوجھتا ہے۔ بیوی اور بیٹی کو اُس کی ضرورت نہیں تھی ـــــ فکر نے اُس کو نڈھال کر دیا تھا۔ وہ دن رات مریض کی طرح بستر پر پڑا رہتا تھا۔ اور اتنی کم سنی میں ہی اس کے یکا یک کنپٹیوں کے بال سفید ہو گئے تھے۔

چہرے کی جھریوں میں یکلخت اضافہ ہو چکا تھا۔ پیشانی اور آنکھوں کے کنارے ننھی ننھی لاتعداد لکیریں نمودار ہوگئی تھیں۔ کثرتِ سگریٹ نوشی نے ایک دن میڈیکل رپورٹ میں اُس کے پھیپھڑوں کو چھلنی کر کے پیش کیا تھا۔ اُسے دمّے کی بیماری نے اندر سے کمزور کر دیا تھا۔ اسے گھر کے اندر گرمی کی ضرورت تھی۔ لیکن بیوی بیٹی کی حد سے بڑھی ہوئی بے اعتنائی اور لاتعلقی نے اُسے چڑ چڑا بنا دیا تھا ـــــــ اور پھر ایک روز، رات کی کپکپاتی ہوئی سردی نے اُسے شراب خانے کے دروازے تک پہنچا دیا ـــــــ شراب نے اس کے بدن میں گرمی اور نشے نے بے خودی جگادی، یوں غم غلط کرنے کے اِس سہارے نے اُس کی زندگی کو دوسری ڈگر پر ڈال دیا ـــــــ مے خانے سے شناسائی نے اُس کی زندگی کے دس پندرہ برس چرا لیے۔ بیوی کی ضرورت، گھر کی خواہش، بڑھاپے کے سہارے کی حسرت، یوں ایک ایک کا خون ہوتا رہا..... پھر ایک دن اس کی بیٹی کی شادی ہوگئی۔ اُس کی بیوی کو ایک گھر داماد مل گیا تھا ـــــــ اُس رات وہ باہر شبنم میں سویا تھا۔ اُس رات کے بعد وہ ہر رات باہر ایک جھلنگی چارپائی پر سویا کرتا تھا کیوں کہ داماد کے آجانے سے اب گھر میں جگہ نہیں رہی تھی۔

صبح ہوئی۔ وہ اُٹھ کر صبح کی چائے پی رہا تھا۔ شفق پر تھرتھراتا ہوا سورج جانے کس خوف سے اس طرح تھم تھم کے اُوپر اُٹھ رہا تھا گویا پھر دوبارہ نہیں نکلے گا۔ تبھی چوں چوں کی آوازیں آنے لگیں۔ جھروکے کے نیچے دیکھا تو فرش پر دو عدد انڈے کے چھلکے پڑے تھے۔ کبوتر کے آشیانے میں تازہ بچوں کی بھرمار تھی۔ مادہ اپنے سینے کے پروں کو پھلا کر غٹرغوں غٹرغوں کر رہی تھی۔ اُس کی آواز میں نرمی اور مصری کی ڈلیوں کے ٹکرانے کی سی آواز تھی ـــــــ لیکن وہاں کبوتر نہیں تھا۔ میرا دل کانپ گیا۔ ادھر ادھر دیکھا تو آشیانے میں نئے نئے مہمانوں کے آجانے کی وجہ سے اب جگہ باقی نہیں رہی تھی۔

میرا ناول آخری مرحلے سے گزر رہا تھا کیوں کہ جس گھر کی بنیاد محبت اور امن و آشتی پر رکھی گئی تھی اُس گھر میں اب تلخی گھل چکی تھی اور وہ خانہ جنگی اور مار پیٹ کی آماجگاہ بن چکا تھا ___ میرے ناول کا ہیرو بھوک اور تکلیف کی حالت میں شراب پی کر آتا اور نشے میں چور ہو کر مار پیٹ پر اُتر آتا تھا۔ شروع شروع میں اُس کی ان حرکتوں کو بیوی بیٹی برداشت کر لیتی تھیں آخر وہ اپنی بیوی کا خاوند تھا اور اپنی بیٹی کا اکلوتا باپ تھا۔ اسے سزا دینے کے لیے دروازے سے صرف باہر نکال دیتیں ۔ اُسے کھانے کے لیے باہر ہی دے دیتیں۔ لیکن جب وہ زیادہ نشے میں ہوتا تو شرابیوں کی سی کچھ کچی گالیاں بکنا شروع کر دیتا تھا۔ ایک دن جب وہ اپنی بیوی پر اپنے داماد سے ناجائز تعلق ہونے کا الزام عائد کر رہا تھا ___ اُس دن تو حد ہو گئی ___ داماد نے اُس کی وہ پٹائی کی کہ محلے والے بھی تھوُ تھوُ کرنے لگے ___ اُس واقعہ کے بعد سے نا جانے کیا ہوا۔ میرے ناول کا ہیرو بالکل خاموش رہنے لگا......
اب، جب کبھی اُسے دروازے سے باہر کھانا دے دیا جاتا تو وہ وہیں فرش پر بیٹھ کے شیرو نام کے پلّے کو بلا لیتا اور نشے کی حالت میں اُسے چمکار کے پیار سے اپنا کھانا کھلاتا... جب وہ کھا رہا ہوتا تو اُس سے روہانسا ہو کے نہ جانے کیا کیا باتیں کرتا۔
''شیرو بیٹا!... تو اور میں ... وہ اور وہ ... اور وہ ... سب ناپاک، سب حرامی ... پانچالی کہیں کی ___ دوست ... شیرو بیٹا اور مَیں، وہ اور وہ ... اور وہ ... سب کتے، سب کتیاں...
دُنیا؟ ہی ہی تی تی ... ... بیسوا سالی کمینی ... ...'' اسی طرح وہ الٹی سیدھی باتیں کرتا ہوا خاموشی سے شیرو کے سامنے ڈھیر ہو جاتا۔ اور شیرو گویا سب کچھ سمجھتا تھا وہ بیچ بیچ میں اپنی گردن اٹھا کر اپنی تھوتھنی سے اُس کے ہاتھ چاٹتا اور جب وہ سو جاتا تو اُس کی ناک سے نکلتی ہوئی گرم گرم سانس کے قریب اپنی تھوتھنی رکھ کے سو جاتا ___

اور پھر ایک روز میں نے آشیانے میں دیکھا ــــــ کیوں کہ اُن کبوتروں میں میری دلچسپی بڑھتی جارہی تھی ــــــ تو وہ نر کبوتر بیٹھا تنہا غٹرغوں غٹرغوں کررہا تھا۔ کبوتری کے بچے بڑے ہوچکے تھے وہ اُنھیں لے کر پرواز اور دانہ چگنے کی پہلی مشق پر گئی ہوئی تھی ــــــ واپس آتے ہی اُس نے کبوتر کوٹھونگیں مار مار کر آشیانے سے باہر نکال دیا۔ دونوں گتھم گتھا ہوتے رہے۔ بچے اڑنے کے لیے پر تولتے رہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں کی منقاریں اور سفید پنکھ لہولہان ہوکر سرخ ہوگئے۔ پنکھ جب پوری طرح نکل آئے تو دونوں بچے کالے رنگ کے تھے .... آخر کبوتری نے کبوتر کو مار بھگایا۔ اس گتھم گتھا ہونے میں آشیانے کے کچھ تنکے بکھر چکے تھے۔ کبوتر، صبروتحمل کا مجسمہ بنا ہوا کبھی اپنے آشیانے کو اور کبھی بکھرے ہوئے تنکوں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا کرتا تھا۔

میں ناول کے خاتمہ کو لے کر بڑی بے چینی محسوس کررہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں، کیا نہ کروں ــــــ بہت سوچنے کے باوجود میں ناول کے ہیرو ــــــ ایک بڈھے کو بچا نہ سکا۔ آخر اُسے موت کی نیند سلا ہی دیا۔ میں کیا کرتا، کہانی کی مانگ ہی کچھ ایسی تھی کہ اُس بڈھے کی موت یقینی ہوچکی تھی۔

ناول نگار تو محض شروع کرتا ہے۔ پھر تو کہانی خود اپنے آپ کو لکھواتی چلی جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہوا کہ میرے ناول کا ہیرو اپنے داماد سے بلکہ اپنی بیوی اور بیٹی سے پٹ جانے کے بعد پورے بارہ دنوں تک پوری طرح خاموش ہوگیا تھا۔ لیکن اُس رات ــــــ شام ہی سے طوفانی ہوائیں چل رہی تھیں ــــــ اُس کا مرض جب بڑھ گیا تو وہ رات دیر تک شراب پی رہا تھا اور اپنی بیوی بیٹی اور اپنے داماد کے نام کی جی بھر کے گالیاں نکالتا رہا تھا۔ صبح محلے والوں نے بتایا کہ اُس شخص نے اتنی گالیاں اُس سے پہلے کبھی نہیں بکی تھیں۔ دس بارہ دنوں سے اس کی حالت میں کافی

سدھار آ گیا تھا۔ لیکن اچانک کل رات ـــــ ہڈیوں کو چھید دینے والی سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ اور اُس سے بھی زیادہ تلخ وہ گالیاں بک رہا تھا۔ اچانک رات کے آخری پہر وہ یکایک بالکل خاموش ہو گیا۔

میں نے سوچا۔ ''چراغ بجھنے سے پہلے بھڑکتا ضرور ہے۔''

صبح شبنمی گھاس پر اُس کی لاش اکڑی ہوئی پڑی تھی۔

میں ناول ختم کر کے رات بھر سوچتا رہا کہ یہ انجام فطری معلوم ہوتا ہے یا نہیں ـــــ ؟ لیکن بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ صبح اُٹھا تو دیکھا۔ رات کافی اولے پڑے تھے۔ گملے میں لگے پھول کے پودے بکھرے پڑے تھے اور اِن کے درمیان سفید پنکھ والا کبوتر مردہ پڑا تھا۔

۲

سایہ سایہ جنگل

——— یکا یک جو فضا بدلی تو ایک انجماد کی سی کیفیت اور ان کہی صورتِ حال، میرے وجود پر طاری ہوگئی۔ میرے آس پاس ہر چیز تھم گئی۔

لیکن ———

سَنکی گھوڑے سرپٹ دوڑ رہے تھے۔

میں دیہاتی

پہاڑ، جنگل، گاؤں کا رہنے والا

نو دریافت سرحد پر کھڑا انجانے خوف کی دبیز چادر میں جیسے ساکت بنا رہا۔

میں عرصۂ سکوت میں ستون ہوگیا۔

وہ راہ لوہے کی چادر سے بند تھی۔

ریلوے کراسنگ، پھاٹک اور شہر میری نگاہوں میں گڈمڈ تھے۔ ہم اس منزل پر کھڑے تھے، جہاں ہمارے ماضی کی دھند اور حال کا عکس دونوں گلے مل رہے تھے۔ میں نے ذرا پیچھے نگاہ کی تو دیکھا——— وہ تن درست بیل اور ہل،

شاداب درخت اور پھل، ہری سبزیاں اور کھیت، لکڑیاں اور پہاڑ، پتیاں اور جنگل، بھیڑیاں اور چرواہے، مچھلیاں اور تالاب، کھلا آسمان اور پھیلی ہوئی زمین اور سلسلہ وار پہاڑوں کی سرحد نہیں تھی۔ یہاں تو بس ایک ہی سرحد تھی، شہروں کے سرے پر ـــــ پھاٹک، پھاٹک کے اس پار ہم، اس پار "وہ" ـــــ ریل کو کسی قوی ہیکل دیو نے ڈھکیل دیا تھا، وہ مسلسل پھسلتی جا رہی تھی، گزر گئی، ایک زناٹے کی متواتر آوازوں کا ڈھیر اپنی پیٹھ پر لیے جو پیچھے پیچھے گرتی بھی جا رہی تھی۔

.... سارا ماحول دھواں دھواں، گرد گرد، سیاہ سیاہ ـــــ!

میں نے اپنی آنکھوں کے غلاف جھکا لیے .... ایک ذرّہ بھی نہیں داخل ہو سکتا تھا۔ غلاف اٹھے تو پورا منظر ذرات میں جھول رہا تھا۔ میں سر پر پاؤں رکھ کر شہر میں داخل ہو گیا ـــــ خواہشات لامحدود تھیں۔

میں نے بھاگتے ہوئے دیکھا، بہت سارے ریچھ پسینہ میں ڈوبے ہوئے، ریل کے دوزخ میں بے تحاشا کالا پتھر جھونک رہے تھے، ان کے دونوں ہاتھوں میں بوتلیں تھیں، جن میں انگور کی بیٹی مچل رہی تھی اور جسے وہ وقفے وقفے سے منھ سے لگاتے جاتے تھے۔

شمسی شعاعوں نے اپنے نیزے کو مغز تک چبھونا شروع کر دیا۔ پیشانی کو چھید کر جب پسینہ نے باہر دیکھا تو میں دوسری دنیا کی خواہش لیے، اپنے دل کے تہہ خانے میں چھپائے، دیوانہ وار آگے بھاگا۔

میں نے سوچا کوہستانی شگاف ہے ـــــ جب فلک بوس عمارتوں کے گھنے جنگل سے رینگتی ہوئی سڑک کو پہلی نظر میں دیکھا۔ جا بجا اونچی اونچی تنگ اور دم گھٹتی ہوئی یونانی قبریں تھیں، جنھیں محض دیکھ کر ہی سانسیں رکنے لگیں، میں نے سنا کوئی کہہ رہا تھا، یہ گلیاں بڑی کارآمد ہیں یہ نہ ہوں تو شہر میں دم ہی گھٹ کر رہ جائے، میں

نے مڑکر دیکھا کتے بات کر رہے تھے۔

.....لیکن، میرے پلّے نہ پڑی!

نکی گھوڑے سرپٹ دوڑ رہے تھے۔

میں دیہاتی

پہاڑ، جنگل، گاؤں کا رہنے والا

یکا یک خوف نے شمشیر بدست ہوکر میرا تعاقب کیا۔ پھر میں نے دیکھا یہاں بے بس انسان اپنے کندھوں پر بھینس کا سر ڈھوئے پھر رہے تھے۔ غلے کے بڑے گوداموں اور دکانوں میں بڑی توند والے لوگ مزے سے ٹانگ سکوڑے ہاتھ پھیلائے سپید کیچڑ میں دھنسے بیٹھے تھے۔ وہ جگالی کر رہے تھے۔ آنکھوں کی نالیوں سے غلاظت بہہ رہی تھی جسے سیاہ بھجنگ کوے اپنی نوکیلی چونچ سے کھود کھود کر کھا رہے تھے۔ دو ایک چموکن گردن سے لٹکے ہوئے خون چوس رہے تھے، وہ اپنے غباروں پر مسلسل ہاتھ پھیرتے اور مسلسل جگالی کرتے جاتے تھے ــــــ بس خالی جگالی، چند کتے کے تھوتھنی والے جن کے منھ سے رال ٹپک رہی تھی۔ ان کے سامنے دم ہلا رہے تھے، میں آگے بڑھ گیا۔

نکی گھوڑے سرپٹ دوڑ رہے تھے۔

شمسی شعاعوں نے اپنے نیزے کو پیٹھ پر چبھونا شروع کر دیا۔

میرا جسم ان نیزوں سے چھلنی چھلنی ہونے لگا۔ میری پیٹھ اور کمر سفید لہو سے رنگنے لگیں۔ میرے برہنہ تلووں کو سیاہ انگارے چاٹنے لگے ــــــ میں تاب نہ لاکر بلند عمارتوں کی اوٹ میں پناہ ڈھونڈنے لگا۔ دفعتاً ایک نیا منظر حیران کر گیا۔

چند ریچھ کولھو کے بیلوں کو ہل میں جوت رہے تھے، بلند عمارتیں ــــــ دور تک سایہ ــــــ ایک طرف بلند و ارفع ایوانوں کے قدم چومتے سایوں کا انبار ہے تو دوسری طرف ــــــ دور، بہت دور ــــــ مٹھی بھر سائے کو ترستی ہوئی

لنڈمنڈ اور ننگی جھونپڑیاں، جو کسی عصمت دری کا شکار دوشیزہ کی طرح اپنے نیم عریاں جسم کو چیتھڑے سے ڈھانپنے کی ناکام کوشش میں الجھی ہوئی تھیں ـــــ شاید اندھی فطرت اب برف بن گئی ہے ...... حدِ نگاہ تک سنگ ہی سنگ ـــــ عمیق نیلگوں سیاہی مائل فام اور سبز کائی رنگ چٹانیں، سنگلاخ زمین کے حدبی و جونی سینہ پر جتے ہوئے بیل ـــــ جھلتے سینے سے اٹھتا ہوا دھواں اور قطرہ بھر لہو کو تڑپتا ہوا فگار سینۂ ارض ـــــ چٹاخ چٹاخ ـــــ ایک طرح کی چٹختی آواز کے ساتھ بکھیرتے ہوئے پارۂ سنگ ـــــ سنگ ریزے، میں کراہ اٹھا، انسانی کھوپڑیاں اپنے پیچھے بیل کا بدن گھسیٹ رہی ہیں۔ اوپر لیکن نزدیک ہی گدھوں کا ایک جھنڈ اپنی آنکھوں کو اپنے مخروطی سروں کے آگے سجائے رقصاں ہے...... منڈلا رہا ہے، بیلوں کی آنکھوں پر کالی پٹی ہے۔ ان کے بدن لہولہو ہو رہے ہیں ـــــ کوڑے کی چوٹ سے جب کوئی بیل چلتے چلتے زخموں کی تاب نہ لاکر بیٹھ جاتا ہے، دوسرے ہی لمحہ تعینات ریچھوں کے کوڑے کی موسلادھار بارش تیز ہو جاتی ہے ...... وہ اٹھ جاتا ہے۔

یہ منظر ـــــ میرے اندر اندر کچھ سلگنے لگا، کوئی سسکنے لگا، کوئی چیخ اٹھا [ـــــ کمینہ بدذات ـــــ] یہ ریچھ مڑتے ہی میری طرف اپنی انگاروں بھری سرخ آنکھیں اچھال دیتے ہیں۔

میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ میرے نصیب میں اس کے سوا تھا ہی کیا؟ [ـــــ احمق جون پور کا قاضی ـــــ] چلنا میرا مقدر کہ حرکت زندگی ہے ـــــ بس میرے سر پر تو ایک ہی بھوت سوار ہے۔ مطالعہ، مشاہدہ ـــــ مشاہدہ، مطالعہ، اور خواہشات لامحدود اور ان کا مقدر بھی معلوم ـــــ

ننگی گھوڑے سرپٹ دوڑ رہے تھے۔

شمسی شعاعوں نے اپنے نیزے کو پشت پر چبھونا شروع کر دیا۔

میں تلملا کر سوئمنگ پل پر چڑھ گیا۔ بلند و بالا عمارتوں کا گھنگھور جنگل، ناف شہر، ہر چہار جانب متحرک اژدہام، بینکوں میں تھانہ میں ڈاکخانہ میں ریڈیو اسٹیشن میں ٹی وی ٹاور اور اسپتالوں میں رینگتی ہوئی بھیڑ ــــــ میں نے کورینا پر دباؤ ڈالا تاکہ لینس کا سنٹر آف کرویچر کم ہو جائے۔ اور اپنی آنکھوں سے دوربینی شروع کر دی۔ میری نگاہ ایک عمارت سے دوسری عمارت پر چوکڑیاں بھرنے لگی، اس نے پیغام بھیجا، ان تنظیموں اور اداروں پر بوزینوں، میمونوں اور بندروں کا قبضہ ہے..... بندر اکثر سپید لباس میں ملبوس تھے اور یہ کہ ان کی دمیں نہیں جو شاید گزشتہ کسی نسل کے ساتھ معدوم ہو چکی تھیں ــــــ کام میں منہمک ــــــ کسی سے زیادہ بات نہیں کرتے تھے، کاش خدانخواستہ میں ہی بندر ہوتا تو ان ہی دم گھٹتی فضاؤں کا اسیر ہوتا، میرے دل نے تنقید کی، کام ادھک باتیں کم، میں وہاں سے کھسکنا ہی چاہتا ہوں (کیوں کہ سوئمنگ پل پر بیٹھے بیٹھے میرے دونوں ران کٹ گئے ہیں) کہ چند بندر اور بوزینہ میری طرف لپکے ــــــ اور میں وہاں سے ایک بار پھر بھاگ کھڑا ہوا۔

میں دیہاتی

پہاڑ جنگل گاؤں کا رہنے والا

"........ ــــــ ...."

آخری بار ہانپنے کے بعد میں نے دیکھا تھا ــــــ میرے پیش رو ــــــ عنکبوت کا تازہ جال ہے۔ کالے رنگ کا جال، اپنے مصنوعی ہونے کا، اپنے موٹے پتلے خد و خال کا، بذریعہ نمائش، اعلان کر رہا ہے۔ غور کیا تو، اس پر گاہے گاہے کالی جوئیں رینگنے لگیں ..... جلے حروف کے نیچے ٹاؤنس اور روڈس دبے ہوئے ہیں اور عنکبوت کے تازہ جال میں قید ــــــ سائن پوسٹ، میں نے اپنے بائیں ہاتھ کی مٹھی کے پوروں کو ہٹا کر بھیجے ہوئے مغز کو نکال کر اس پر جمی ہوئی گرد کی تہہ کو صاف

کیا۔ پھر کھوپڑی کے جوفی کوزے میں ڈال کر بند کردیا ــــــ تب جو احساس جاگا تو تماشا یہ تھا کہ ایک کشادہ تسلے میں چھوٹی بڑی سوکھی ہوئی تارکول کی سوئیاں آڑی ترچھی اڑی کھڑی پڑی ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے تسلہ زوروں سے چکرانے لگا۔ اور سوکھی سوئیاں ساکت ــــــ ان کی جگہ گھٹاٹوپ اندھیرے نے لے لیا۔ اچانک غیر متوقع طور پر گہری اسپارکنگ ہوئی ــــــ میں چمک گیا، میرے عقب میں کوئی شے روشن ہے، شاید ــــــ پرچھائیوں کے خونی ناخن؟؟؟ یا ــــــ دانت!!

فی الفور، میں وہاں سے پانی ہوگیا۔

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے.... رفتہ رفتہ.... منظر منظر.... بین بین

دور کھڑی میرے ادراک کی دوشیزہ مسکرا رہی تھی، وہ مجھ سے روٹھ چکی تھی ــــــ میرا ظرف فہم صدا دے رہا تھا۔ مغز کی انگلیوں نے تھک کر بانہوں کو چشم التجا کے سہارے ٹٹولا اور دماغ نے خوشامد میں بانہیں پھیلا دیں لیکن کم بخت ہر بار مچل گئی۔ تنگ آکر پنجوں نے اسے دبوچنا چاہا.... اور وہ تتلی بن گئی۔ تعاقب کیا.... بچھیا بن گئی۔ پکڑنے کے لیے دوڑ لگائی.... طویل چوکڑیاں بھرنے لگی ــــــ غزالہ بن گئی تب ہی کچھ ایسا واقعہ پیش آیا کہ میں آگے وہ پیچھے ــــــ وہ آگے میں پیچھے ــــــ اندھیرے میں ہم دونوں دوڑ رہے تھے۔

ننگی گھوڑے سرپٹ دوڑ رہے تھے۔

ــــــ اور میں ساکت و ششدر۔

آہنی درخت کے گاڑھے سائے میں، یہاں سے وہاں تک، قطار در قطار، چبوترے کے اوپر فضا میں، جوق در جوق مختلف خدوخال کی آنکھیں معلق ہیں۔ خشک آنکھیں، گیلی آنکھیں، روشن آنکھیں، بجھتی آنکھیں، ادھ کھلی آنکھیں، ڈبڈبائی آنکھیں، بہتی آنکھیں ــــــ ایک دوڑتی ہوئی، کریہہ پھنکار، ــــــ ایک سمت تکتی ہوئی Stimulate آنکھیں.... اور پھر دفعتاً تنگ و سنگلاخ راہ سے سرخ خونخوار آنکھوں

والے فولادی اژدہے کی آمد۔ فولادی جسم والے اژدہے کے جابجا عمودی و افقی مستطیل نما خلا سے اجنبی آنکھوں کی برآمدی اور تھکی ماندی آنکھوں کا ایک بار پوری قوت سے حوصلہ باندھ کر مستطیلوں کی خلاؤں کو پاٹ کر اژدہے کے جسم کے اندر پیوست ہونے کا منظر ـــــ بعدازاں بھینس کے سر والے آدمیوں، بیل کے بدن والی انسانی کھوپڑیوں، ریچھوں، کتوں اور بندروں کی مختلف معاون ندیوں کا بہتا ہوا منھ زور پانی، جو امنڈ کر تارکول کی پھیلی شاہراہ پر گنگا کا سیلاب بن چکا ہے۔

مخصوص مزاحمت والے مقام پر بھینس کے سر والے نے مجھے دیکھ کر عجیب غضب ناک انداز سے سینگ گھمایا اور میری روح فنا ہوگئی اور میں سیل رواں کے خلاف ہاتھ پیر مارنے لگا، تیرتے تیرتے میرے تمام عضو چھل چھل گئے۔

میں دیہاتی

پہاڑ، جنگل گاؤں کا رہنے والا

بچتا کنتا، اژدہام پھلانگتا اب میں، گول چکر پر براجمان ہوگیا ہوں۔ اس گول چکر سے مختلف شاخیں پھوٹی تھیں۔ ایک بازار کی طرف، ایک اسپتال اور پولیس چھاؤنی کی طرف، ایک کارخانے کی طرف اور ایک ندی اور انجینئرنگ کالج کی طرف ـــــ شہر کا شہر سڑکوں پر اتر آیا تھا۔ بے شمار سروں کی متحرک قطاریں فضا میں معلق تھیں۔ ان کا ایک جم غفیر تھا، جو سیلاب کی طرح امنڈتا ہی چلا آتا تھا، ہر طرف بے رخی کے سائے رواں دواں .... کوئی نہیں پوچھتا ـــــ تمھارے منھ میں کتنے دانت ہیں اور تم کہاں جاتے ہو؟ پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورا شہر روشنی کے دودھیا سمندر میں غرق ہوکر جگ مگ جگ مگ کرنے لگا، بے پناہ روشنی میں آنکھیں چوندھیانے لگیں۔ میں آہستہ سے نیم روشن ـــــ یا نیم تاریک گلیوں میں داخل ہوگیا۔

ننگی گھوڑے سرپٹ دوڑ رہے تھے۔

شمسی شعاعوں نے اپنے نیزے کو کسی عمیق کھائی میں اتار دیا تھا ـــــ

سورج کو پرانے خرانٹ اژدہے نے سڑک لیا تھا ــــــ اب سے بہت پہلے ہی ــــــ

میں اندھیرا پھلانگتا ہوا آگے بڑھ رہا ہوں۔ ہر ایک قدم کے بعد دوسرا قدم رکھتے ہوئے یہ قدم کھائی میں جا رہتا ہے اور تنے ہوئے رسے پر چلتے چلتے میں ایک دم منھ کے بل گر پڑتا، لیکن وہاں کھائی کی جگہ حدبی قبریں ہوتیں۔ اس وقت سامنے جو کچھ بھی میں نے دیکھا یا سنا، وہ مجھے جامد کردینے کے لیے کافی تھے۔ کانچ کی چوڑیوں کی کھنکناہٹ کی دھن پر پرچھائیوں کے تیرہ تیرہ ہاتھ رقصاں تھے.... .. ساتوں سر اپنی پوری جوانی سے گونجتے تھے، میں نے اپنی دشا بدلی اور اندھی دشاؤں میں بے تحاشا بھاگنے لگا۔ معاً کسی گیلے وجود سے جا ٹکرایا ــــــ ایک انوکھے قسم کی گدازیت کا لمس .... .. میں کہاں پھنس گیا؟ پھر تو خود کو میں نے پرچھائیوں کے جھرمٹ میں قطعی گھرا پایا۔ پرچھائیوں کی زلفیں میرے بازوؤں پر پریشان ہونے لگیں۔ میں انھیں سراپا سوالیہ نگاہوں سے ٹٹولنے لگا۔ ''یہ دنیا ــــــ ! ہم دل کی دنیا آباد کرتے ہیں، تم بھاگتے لمحوں میں سے کچھ حصے میرے نام کردو .... .. یہ ان تاریکیوں کا ازلی حق ہے ــــــ .... .. اور نہ جانے کب تک، میں ان غاروں میں ــــــ ایک ایک کرکے اترتا رہا.... ..

سنکی گھوڑے سرپٹ دوڑ رہے تھے۔

میں دیہاتی

پہاڑ، جنگل، گاؤں کا رہنے والا

گزشتہ واقعات کو لے کر بھینس کے سر والے سے الجھ پڑا.... .. [ــــــ شیطان بدھو ــــــ] دیکھتے ہی دیکھتے اس کا چہرہ لال چیونٹیوں سے ڈھنپ گیا ہے۔ دانت کی چکی پسنے لگی اور تھوتھنے سے جھاگ نکلنے لگی۔ میں نے دیکھا معاملہ گمبھیر ہے، میں نے چپکے سے سیدھی راہ اختیار کی۔

پھاٹک کھلا تو پورا منظر ذرات میں جھول رہا تھا۔

دفعتا اور نا گہانی امڈتے ہوئے طغیانی ہجوم نے مجھے بری طرح کھدیڑ دیا ــــــ

اُس پار پھاٹک ــــــ پھاٹک کے اس پار ہم ــــــ اس پار "وہ" ــــــ

میں دیہاتی

پہاڑ، جنگل، گاؤں کا رہنے والا

اپنے وجود کا بوجھ کاندھوں پر لیے متانت سے ڈھو رہا ہوں [ــــــ جاہل اجڈ ــــــ] لیکن ہوا سے باتیں کرتا ہوا اپنے آبائی خطہ ارض کا کئی کئی چکر کاٹ آتا ہوں ..... برگد کی گھنی اور جھولتی ہوئی شاخوں میں چھپ کر اس خطہ ارض کو دیکھتا ہوں، اور حیران رہ جاتا ہوں۔

سارا کا سارا گاؤں بلند چمنیوں سے دھواں بن کر اڑ گیا ہے۔ اور کہیں دیہات کا دیہات بھٹیوں کے دوزخ میں جھونک دیے گئے تھے، جہاں یہ شعلے بن کر لہک رہے تھے..... بھیگ رہے تھے ..... سلگ رہے تھے ..... جنگل تھے ..... لیکن ملوں اور فیکٹریوں کے جنگل ــــــ پہاڑوں کی شاداب پستانوں کو چیر کر کالج کے ہنگامے اور سینی ٹوریم کی پرسکون آبادی ــ میں سراسیمہ رہ گیا ہوں۔ انھیں کیا سمجھوں، ضروری اور غیر ضروری اشیا کے درمیان کون سا خط امتیاز کھینچوں۔ پنگھٹ پر پانی بھرنے والی پازیب کی جھنکار اب کہاں گئیں اور برگد کے نیچے چوپال کی بیٹھک اتنی ویران کیوں ہے؟ شاخیں بار بار آنکھوں پر جھول جاتی ہیں اور مجھے کوفت ہونے لگی ہے .....

پھاٹک کے اس پار بھی راتوں رات ملوں، فیکٹریوں، بنکوں، آفیسوں، اسپتالوں، تعلیمی اداروں، سنیما گھروں، ریلوے اسٹیشنوں، ٹی وی ٹاور، بڑے گوداموں اور دکانوں پر وہی بھینس کے سر والے آدمیوں، بیل کے بدن والی انسانی کھونپڑیوں، ریچھوں، کتوں، بوزنوں، میمونوں، بندروں، چھوکنوں، گدھوں اور پرچھائیوں کا عکس ثبت ہو چکا ہے۔

یکا یک، چند کتوں کے ایک غول نے مجھ پر حملہ بول دیا..... چاروں طرف کتوں کے سر ہی سر نظر آرہے ہیں۔ میں نے بے تحاشا بھاگتے ہوئے آنکھیں پشت پر رکھ کر دیکھا، وہ دیوانہ وار میرا تعاقب کر رہے ہیں۔ میں ہوا میں اڑ رہا ہوں..... میں مسلسل بھاگ رہا ہوں..... بھاگتے بھاگتے میرے اعضاء کٹ کٹ گئے ہیں ـــــ جسم لہولہان ہوگیا۔ حتیٰ کہ نوبت رینگنے کی آگئی ہے ـــــ یکا یک اک مقام پر رک گیا ہوں، وہ کتے بھی میرے گرد جمع ہوگئے ہیں۔ خونی آنکھیں، لالچی آنکھیں، بھوکی آنکھیں، بھیگی آنکھیں مجھے عجیب انداز سے گھورنے لگی ہیں [ـــــ ہونق احمق الذی ـــــ] میں نے خود کو ناچار پاکر ہفت منزلہ عمارت کی لفٹ کا بٹن دبا دیا ہے ـــــ کتوں سے نجات ملی، یہ بنک ہے میں نے برانچ منیجر کی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے سوچا۔

''اب میں محفوظ ہوں۔''

کاغذ کے ایک ٹکڑے پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچتے ہوئے میری نگاہیں نہ جانے کیسے آئینے سے ٹکرا گئیں۔

.....اور میں دنگ رہ گیا۔

میری صورت..... رفتہ رفتہ..... بندر کی ہوگئی ـــــ

۳

پھول کا بوجھ

یکایک وہ نیند سے بیدار ہوگیا جیسے کہ وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ کر چونک پڑا ہو۔ اس کی آواز سے بے چینی ظاہر ہورہی تھی۔ وہ چیخ رہا تھا۔ "نہیں ..... ! نہیں سلمیٰ! نہیں ..... ! میں تم سے شادی نہیں کرسکتا۔" اور پھر دم بھر کو وہ بالکل خاموش ہوگیا۔ اُس کے بعد خود بخود اُس کے دونوں ہاتھ دُعا کے لیے اُٹھ گئے ـــــــ

"اے خدا! تو مجھے قوت دے تا کہ میں اپنے جذبات پر قابو پاسکوں، تو مجھے توفیق عطا فرما کہ میں اپنے والدین کے حقوق ادا کرسکوں، تو مجھے اس لائق بنا کہ میں اپنے بھائی بہنوں کے کام آسکوں۔"

سلمیٰ اُس سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ سلمیٰ کے حسن کا جادُو اُس پر ایسا چلا تھا کہ اُس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب ہوتی جارہی تھی۔ سلمیٰ ایم۔فل کی ریسرچ اِسکالر تھی اور وہ پی۔ایچ۔ڈی کررہا تھا۔ اُن کے تعلقات ڈھائی سال پرانے تھے۔ پہلی ہی ملاقات میں اُس نے اپنا دل دے دیا تھا، جب وہ اُس کی یونیورسٹی میں داخلے کے لیے انٹرویو دینے آئی تھی۔ پھر تو ـــــــ اُس کی شامیں رنگیں ہونے لگیں،

دن زلفوں کے سائے تلے ڈھلتے اور راتیں پلکوں کی چھاؤں میں نم ہوتیں۔ عہد و پیماں ہوئے، قسمیں وعدے کیے گئے، پیار و وفا کے نغمے گائے گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ــــــ وقت کو پر لگ گئے اور اب گزشتہ ماہ سلمٰی نے اپنا مقالہ جمع کر دیا تھا۔ وہ غمِ دوراں سے خود کو قدرے آزاد محسوس کر رہی تھی۔ کل رات وہ اُس کے ڈرائنگ رُوم میں دیر تک بیٹھی رہی تھی، جانے سے پہلے اُس نے اِس مَنطقی استدلال کے ساتھ اپنی شادی کی تجویز رکھی تھی کہ وہ اِسے ٹال نہ سکا تھا۔ یہ سب باتیں سوچتے سوچتے وہ نڈھال سا ہونے لگا۔

"لیکن"۔ وہ منہ ہی منہ بڑبڑانے لگا۔ "یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اُس کی بہن گھر میں کنواری بیٹھی ہے اور وہ شادی کر لے؟؟ ــــــ وہ سوچتے سوچتے تقریباً چیخ اُٹھا۔ "نہیں.....! نہیں سلمٰی نہیں .....! میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔"

اُس کی چھوٹی سی گڑیا جیسی بہن نکہت اب کتنی بڑی ہو گئی تھی، پچھلے دنوں گرمی کی چھٹی میں جب وہ گھر گیا تھا، کتنی خوش ہو رہی تھی وہ۔ لیکن دو مہینے کیسے بیت گئے کچھ پتہ نہیں چلا۔ جب وہ آنے لگا تو نکہت کے چہرے پہ ایک انجانے خوف، اور دَبے ہوئے کرب کو دیکھ کر وہ کانپ اُٹھا تھا۔ آج سے دو سال پہلے اس کی صحت کتنی اچھی تھی لیکن اُس وقت وہ کتنی دُکھی معلوم ہوتی تھی، جب اُس نے چلنے کے لیے سوٹ کیس اور بیڈنگ اُٹھائے تھے۔ وہ دوڑ کر آئی تھی اور اُس کے سینے سے لگ کر رونے لگی تھی۔ "تم کب آؤ گے، بھیا؟" کتنا درد تھا نکہت کی آواز میں۔ "اب کے دیر مت کرنا، میرے اچھے بھیا، تمہارے بغیر یہ گھر کتنا سُونا سُونا لگتا ہے۔"

اُسے لگا جیسے نا جانے کب سے وہ یہ بات کہنا چاہتی تھی لیکن کسی مفاہمت کی بنا پر اسے اپنے سینے میں دَبائے ہوئی تھی لیکن آج مفاہمت کا وہ وزنی پتھر اُٹھ چکا تھا۔ اُس کی معصوم آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اُنھیں دیکھ کر اُس کی بے بسی نے اُسے رونے پر مجبور کر دیا تھا۔

واقعی! بہن کی بے بسی ایک درد مند بھائی کے سوا دُنیا کا کوئی شخص محسوس نہیں کر سکتا ____

اس کی سوچ کی سمت بدل گئی، وہ سوچنے لگا ____ اُس کا گھر کتنا خوبصورت تھا، خوش حال کنبہ، کنبے میں والدین کے علاوہ اُس کی تین بہنیں تھیں اور تین بھائی، جن میں سے دو بہنوں کی شادی اُس کے باپ نے کتنی خوشی سے کھیت اور زمینیں بیچ بیچ کر دی تھیں۔ اُنھیں اپنے بیٹوں پر بڑا آسرا اور بھروسہ تھا اور دل میں نہ جانے کیسے کیسے ارمان تھے۔ لیکن شادی ہوتے ہی وہ ایسے بدل گئے کہ اپنی اپنی بیویوں کے ہو کر رہ گئے۔ جن بیٹوں کی لوگ مثالیں دیا کرتے تھے۔ وہ اب بیویوں کے اشاروں پر چلنے لگے تھے۔ انھیں شادی کے بعد گھر سے، پہلی سی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ ایک ایک کر کے گھر سے نہ صرف الگ ہو گئے تھے بلکہ جاتے جاتے اُن کی بیویوں نے اُس کی فرشتہ صفت ماں پہ الزامات بھی عائد کیے تھے۔ لیکن اُن دونوں کے کانوں پر جوئیں تک نہ رینگی تھیں ____ یکا یک اُسے وہ منظر یاد آیا ____ جب اُس کے منجھلے بھائی گھر سے جاتے وقت غصے میں سامان پٹک رہے تھے۔ اُس نے اُس وقت اپنے والد کا چہرہ دیکھا تھا۔ وہ چہرہ جو کبھی سرخ اور بھرا بھرا سا تھا۔ اُس وقت یکایک سو سال بوڑھا ہو چکا تھا۔ ہزاروں جھرّیاں چہرے پے یکلخت نمودار ہو گئی تھیں۔ سر کے بال سمیت داڑھی اور مونچھیں بھی سفید نظر آنے لگی تھیں۔

اُس کی سوچ کا دائرہ پھیلتا چلا گیا ____

اُس کی بہن کی شادی تو دو سال پہلے ہی ہو گئی ہوتی! کتنا اچھا رشتہ تھا۔ اس کی ماں نے بہت دَوڑ دُھوپ کے بعد وہ رشتہ طے کیا تھا۔ لڑکا اونچے خاندان کا تھا۔ اصل میں لڑکے کی ماں اُس کی ماں کے بچپن کی سہیلی تھی۔ اس لیے رشتہ جلد ہی طے ہو گیا تھا۔ لڑکے میں صرف یہ کمی تھی کہ وہ پڑھا لکھا نہ تھا۔ البتہ وہ کٹنگ ماسٹر کا کام سیکھ رہا تھا۔ چھ مہینے تک، ہونے والے سمدھی اور سمدھن کی خوب خاطر مدارت

ہوتی رہی لیکن قسمت کو شاید منظور نہ تھا۔ جب اس کے بڑے بھائی سعودی عربیہ سے آئے تو لڑکے نے کاروبار شروع کرنے کے لیے جہیز کے طور پر ایک لاکھ روپے نقد کی مانگ کی تھی۔ اُس کے بڑے بھائی کے لیے یہ رقم کوئی بڑی بات نہ تھی لیکن اُنھیں لڑکا پسند نہیں آیا تھا۔ اس لیے رشتہ ٹوٹ گیا ـــــــ

شادی کے بعد پتہ نہیں کیوں کنواری بہنیں، بھائیوں پر بوجھ بن جاتی ہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اُس کی واحد کنواری بہن کا رشتہ ایک معمولی بنکر طبقے سے تعلق رکھنے والے خاندان میں طے کر دیا گیا تھا۔ بھائیوں نے حامی بھی بھرلی تھی۔ لڑکا پڑھا لکھا تھا۔ اس کی تعلیم بی۔کام تھی لیکن بے چارہ بے روزگار تھا۔ جب وہ مٹھائیوں کا پیکٹ لے کر اپنے والدین کے ساتھ بات پکی کرنے گیا تھا۔ اُس نے دیکھا۔ ایک ناٹے قد کا کنجوس اور مکّار قسم کا شخص لمبی لمبی ڈینگیں ہانک رہا تھا۔ آخر کار اُس نے اپنے بیٹے کی طرف سے فرمائش کچھ اس طرح رکھی تھی۔ اُس شخص کے الفاظ اب بھی اُس کے کانوں میں گونج رہے تھے ـــــــ

''اُسے کچھ نہیں چاہیے، گرم سوٹ اور ٹھنڈا سوٹ تو آپ دیں گے ہی، اُسے ایک ماروتی بھی دے دیں۔ اور لڑکے کی ماں چاہتی ہے کہ واشنگ مشین اور فریج تو آج کل عام بات ہوگئی ہے لیکن کلر ٹی وی ذرا بڑا ہی رہے تو اچھا ہے۔ سارے زیور تو آپ سونے کا دیں گے ہی اُس کی چھوٹی بہن کی خواہش ہے کہ چاندی کا کمر بند بھی ضرور دیں اور میں سمجھتا ہوں، اکاون ہزار روپیہ نقد آپ سلامی تو دیں گے ہی۔ بس اور کسی چیز کا لالچ نہیں ہے مجھے، اللہ کا دیا میرے گھر میں سب کچھ ہے ـــــــ اس کے علاوہ جو آپ دیں گے وہ لازمی طور پر اپنی بیٹی ہی کو دیں گے۔

ظاہر ہے بات ختم ہونی ہی تھی، ہوگئی ـــــــ

اِس بار جب وہ دو سال کے بعد گھر گیا تو وہ بہت خوش تھا۔ اُس کی بہن کی بات پکی ہو چکی تھی۔ شادی کی تاریخ رکھی جا چکی تھی۔ اِس بار اُس کے بھائی صاحب

بھی ماروتی دینے کو تیار تھے۔ لڑکا اچھا مل گیا تھا۔ ایک بڑی کمپنی میں ملازم تھا۔ خاندان، بس سمجھ لیجیے کہ لڑکے کی ماں سیّد تھی اور باپ پیشاوری پٹھان تھا۔ اُن لوگوں نے آکر منگنی بھی کر لی تھی۔ لڑکے والے نکہت کی تصویریں بھی کھینچ کر لے گئے تھے لیکن لڑکی اپنے مجازی خدا کو دیکھنے کی بات تو دور ـــــ اس کی تصویر دیکھنے سے بھی محروم تھی۔ اُس پر طرہ یہ کہ اُس کے بھائی اور بہنوئی سبھی اِس بات پر رضامند تھے کہ اِس بار تو شادی کسی بھی طرح ہو ہی جانی چاہیے۔ گو، نکہت اُن کے سَروں پر بھاری بوجھ تھی جسے وہ سب کے سب مزید ڈھونا نہیں چاہتے تھے، دوسری طرف والدین کی بھی ہمت پست ہو چکی تھی، وہ اسے گھر میں کنواری بیٹھا کر اپنی عاقبت خراب کرنا نہیں چاہتے تھے ـــــ شادی کو صرف پندرہ دن باقی رہ گئے تھے۔ اُس نے جب لڑکے کو دیکھا تو ایک دم مایوس ہو گیا۔ لڑکا شکل سے ہی شرابی لگتا تھا۔ نہ صورت، نہ صحت، سیرت کی بات تو دور رہی.....! وہ اِس قدر کمزور تھا کہ اگر ایک بار بستر پر گر جائے تو پھر خدا ہی حافظ اُس کا۔ نماز، روزہ سے دور دور کا واسطہ نہ تھا۔ نا جانے کون کون سے ڈرگ (منشیات) کا عادی تھا۔ گھر کا بڑا لڑکا تھا لیکن منجھلے لڑکے کی شادی پہلے ہی ہو چکی تھی۔ وہ زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا۔ تعلیمی سلسلہ میٹرک سے آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔ چہرے پہ لفنگوں کی سی داڑھی.....

سوچتے سوچتے اس کی فکر غصّے میں بدلنے لگی۔

اُس کی بہن کی بھی غلطی تھی۔ سب لوگ لاکھ کہتے رہ گئے اُس کا پڑھائی میں ذرا بھی جی نہ لگتا تھا۔ آج اُس نے بی۔ایڈ کر لیا ہوتا تو ایک سے ایک رشتہ مل جاتا۔ خود اُس کے دوستوں میں کتنے پڑھے لکھے اور سنجیدہ نوجوان تھے لیکن شرم دامن گیر ہوتی تھی۔ کبھی اس کی زبان کھل نہ سکی۔ صرف اس لیے کہ اس کی بہن زیادہ پڑھی لکھی نہ تھی۔ بھلا اُس کی ضد کے آگے کس کا زور چلتا تھا۔ ہر وقت سنگاردان کے آگے بیٹھے رہنا، سہیلیوں کے ساتھ گپیں مارنا، اس کے سوا اُسے اچھا ہی کیا لگتا تھا۔

"لو اب بھگتو! اب تو خدا ہی پر بھروسہ ہے، اُس نے اگر جوڑا بنایا ہے تو شادی ہو جائے گی ورنہ کوئی کیا کرسکتا ہے۔"

دھیرے دھیرے اُس کی فکر کا زاویہ اُس کی اپنی طرف جھکنے لگا ____

وہ جب بھی شادی کرے گا، پڑھی لکھی لڑکی سے کرے گا۔ ایسی لڑکی جو سنجیدہ ہو اور اپنے کنبہ کے مسائل کو سمجھ سکے اور اُن مسائل کو دور کرنے میں اس کا ہاتھ بٹا سکے۔ وہ جہیز نہیں لے گا۔ وہ نیک اور شریف خاندان کی لڑکی سے شادی کرے گا۔ اُسے پیسے اور مادّی آسائش کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ اُسے تو بس ذہنی آسودگی اور سکون چاہیے۔ سوچتے سوچتے نہ جانے کب اُس کی آنکھ لگ گئی اور وہ نیند کی آغوش میں اتر گیا۔

☆☆☆

صبح ہوئی تو، وہ سلمٰی کے یہاں جانے کے لیے جلدی جلدی تیار ہونے لگا۔ وہ آج سلمٰی کو صاف صاف بتا دینا چاہتا تھا کہ جب تک اُس کی چھوٹی بہن نکہت کی شادی نہیں ہو جاتی وہ اُس سے کسی قیمت پر شادی نہیں کرسکتا ____ وہ تیار ہو کر ابھی دروازے سے نکلا ہی تھا کہ گیٹ سے داخل ہوتی ہوئی، ایک وجیہہ نوجوان کے ساتھ اُسے سلمٰی دکھائی دی ____

اُسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ کیا دیکھ رہا ہے۔ دم بھر کو اُس کی ذہنی سطح پر بھونچال سا آگیا۔ تبھی سلمٰی نے اُس نوجوان کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"یہ میرے کزن ہیں، مسٹر گلزار"۔

"اور آپ" سلمٰی نے اُس کی طرف قدرے شوخی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"جاوید صاحب، میرے دوست، میرے ہمدم، میرے ہمسفر، بس یوں سمجھ لو کہ وی آر میڈ فار اِچ اَدَر سمجھے!" اور کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ نوجوان قدرے جھینپ سا گیا۔ اُس نے سر جھکا لیا۔ واقعی وہ سنجیدہ اور شریف انسان معلوم ہوتا تھا۔ سلمٰی نے رسمی

گفتگو کے بعد جب اصل مدّعا آشکار کیا تو جاوید فرطِ مسرت سے حیران رہ گیا۔ خدا نے اُس کی دُعا سن لی اور سلمٰی کی آواز، اُس کے کانوں میں مسلسل رس گھول رہی تھی۔

''گاؤں میں اِن کی خود کی کاشتکاری ہے۔ لیکن شہر میں رہتے ہیں کیوں کہ شہر میں ان کی بیسیوں دکانیں ہیں۔ والدین ضعیف ہو چکے ہیں لہٰذا اب اُن کی آخری خواہش ہے کہ بیٹا اُن کے جیتے جی شادی کر لے لیکن اِن کی تو بس ایک ہی شرط ہے۔ لڑکی خوبصورت ہو اور ہاں زیادہ تعلیم یافتہ لڑکی اُنھیں نہیں چاہیے، بس اتنی پڑھی لکھی ہو کہ صوم وصلوٰۃ کی پابند ہو۔ دین و دنیا سمجھتی ہو اور گھر کی ذمہ داری سنبھال سکے۔ لہٰذا میں نے انھیں نکہت کی تصویر دکھائی تھی۔ انھیں نکہت بہت پسند آئی۔ اب صرف آپ کی رضا مندی چاہتے ہیں۔

اُسے ایسا لگا دنیا کی ساری خوشیاں اسے اکٹھے مل گئی ہوں۔ اُس نے اپنے مچلتے انبساط کو چھپاتے ہوئے کہا، '' اِس بات کی 'ہاں' اور 'نا' تو آپ کے پاس ہے۔ بس اس قدر میں چاہتا ہوں کہ ــــــ'' اُس نے سلمٰی کی مترنم آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ــــــ ''اپنی گڑیا بہن کے نکاح کے بعد ہی ہم رشتۂ ازدواج میں بندھیں گے یعنی پہلے چھوٹی بہن کی شادی، پھر ہماری!''

اُس نے آخری جملہ کچھ اس انداز سے ادا کیا کہ بے ساختہ طور پر تینوں نوجوانوں کی ہنسی ابھری اور فضا کے خوشگوار آنچل میں دیر تک تحلیل ہوتی چلی گئی۔

۴

میرے طوفاں یم بہ یم

مجھے یقین ہے، جب بھی کوئی مورخ اس دور کی تاریخ لکھے گا تو وہ اسی شیطان سے شروع کرے گا جس کا محل دنیا کے سب سے اونچے کوہستانی سلسلے سے بغلگیر ہے، جس کے صحن میں سہ گوشوں سے بحری موجیں آکر ناریل اور بید کے درختوں سے الجھتی رہتی ہیں، جس کے صحن کے بیچوں بیچ سے ایک بڑی سی ندی بل کھاتی ہوئی خلیج کو بہہ جاتی ہے۔

کیوں کہ اس شیطان نے تو مکاری میں اپنے باپ داداؤں تک کے کان کاٹ لیے ہیں۔

ہماری آبادی میں ایک قصہ بہت مشہور ہے جو اسی سے منسوب کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ جب اس کی شرارت حد سے زیادہ بڑھ گئی تو اس کی ماں نے تنگ آکر اس کے کان اینٹھ کر سمندر کے اس پار پھینک دیا لیکن سمندر پار ریگزاروں پر ننگے پاؤں چلتے چلتے وہ آوارہ گرد ہوگیا اور بالآخر اسے ایک چڑیل زادی سے عشق ہوگیا۔ اس چڑیل زادی کے عشق کی آنچ میں تپ کر اس کی شیطنت اور نکھر گئی تو وہ خود کو خداوند

سمجھنے لگا..... اس احساس برتری میں اس نے جس چیز کو چھوا وہ سونا ہوتا چلا گیا۔

پھر ایک دن اس نے آبادیوں میں جا کر معصوم انسانوں کو سبز باغ دکھائے۔ بہت سے انسان اس کے مکھوٹے کو پہچان نہ سکے لیکن جو انسان اپنے سروں اور ٹھوڑی پر سفیدی رکھتے تھے، مکھوٹے کے آر پار دیکھ رہے تھے۔ وہ اس پر لاحول بھیج رہے تھے۔ تاہم جب اس نے سونے کی چڑیا کی وہ درد انگیز روداد سنائی تو انسان کا دیدہ تر ہوا اور دل پگھل گیا، لیکن اب بھی انسانوں کا وہ گروہ جو اپنا مغز اپنے قبضے میں رکھتا تھا، اس سے بے نیاز تھا لیکن آخر کہاں تک؟ جب اس نے لال پری اور انگور کی بیٹی کی تقسیم کی بابت بڑے رازدارانہ انداز میں بیان کرنا شروع کیا تو نصف سے زیادہ انسان اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ اس کی پوجا ہونے لگی اور وہ اس دھرتی کا عظیم دیوتا تصور کیا جانے لگا۔

..... اور پھر، نادان انسانوں نے اپنی اپنی جھونپڑیوں میں، ایک گوشے میں لگی برسوں سے فرسودہ اور جالے پڑی تصویروں میں سے ایک تصویر ہٹائی اور اس جگہ پر اس کی مکھوٹا لگی تصویر کو سب سے مقدس اور مکتی داتا جان کر چسپاں کردی۔ یوں اس دھرتی کے ایک نئے دیوتا کی پرستش کا بار لاشعوری طور پر انسانوں نے اپنے کمزور کاندھوں پر برداشت کرلیا۔

شاہی تخت پر بیٹھنے کے بعد سب سے پہلے اس نے اعلان یہ کیا کہ ———

''میرے محل کے گرد بسنے والے انسانو! اگر میری پوجا اسی طرح گھر گھر ہوتی رہی تو میں تمھیں ایک نئی صدی دوں گا جہاں بہار ہی بہار ہوگی، جہاں خزاں کا گزر نہیں ہوگا یا اگر خزاں کا گزر ہوا بھی تو گلوں پر اثر نہیں ہوگا۔''

پھر کیا تھا اس کے بھگتوں کی تعداد روز افزوں بڑھنے لگی۔ لوگ ننگے بھوکے پیاسے دوردرشن کے شیشوں میں اس کی تصویر سجائے نئی بہار کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔

لیکن ایک خاص بستی جو اپنے دل سے زیادہ اپنے ہاتھوں پر یقین رکھتی تھی، اس سے ناراض ہوگئی۔ وہ شیشہ دیکھ کر پیٹ کی آنچ بجھا نہیں سکتی تھی۔ لہٰذا اس بستی کے انسانوں نے اپنے ہاتھوں کو تیزی سے استعمال کر کے اپنی بستی کا نقشہ خود بدلنا چاہا تا کہ وہ آنے والی بہار میں عملی طور پر شریک ہوسکیں۔

لیکن اس بات سے شیطان کی خداوندی کو ٹھیس پہنچی اور اس نے پلک جھپکتے میں بے شمار ہاتھوں کو تن سے جدا کروا دیا۔ اس نے چند شیطانوں کو بھیج کر دلوں کے بیچ اپنی مورتی نصب کروا دی اور جب وہ یہ خبر پا کر دورے پر گیا تو بے شمار لولے ٹھوٹھے ہاتھ اس کی سلامی کو اٹھے ہوئے تھے۔ وہ ایک پل کو اپنے مکھوٹے کے اندر سے مسکرایا اور پھر ان لنگڑے لولوں کو اپنے بوٹ کی ٹھوکروں سے ہٹاتا ہوا محل میں واپس آ گیا۔

گیہوں کے بغیر چکیاں زنگ آلود ہونے لگیں۔

شاہی خزانے کی مقدار فٹ پاتھ پر رہنے والوں کے پھیلاؤ کے ساتھ بڑھتی چلی گئی۔ ہوا میں پرواز کرنے والوں اور زندہ درگو ہونے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

ایک شب، اس کے محل کی سرنگوں سے ہوتا ہوا ایک ہرکارہ پہنچا اور کہنے لگا:

”حضور والا! مجھے سالانہ ایک ہزار نوجوان حاملہ عورتوں کی ضرورت ہے، جو سماج میں اپنا وقار بنائے رکھنے کے لیے ہماری کمک حاصل کرنے آتی ہیں۔“ اس نے شیطان کو متجسس پا کر مزید کہنا شروع کیا۔ ”شیطان صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ مجھے خدشہ ہے آنے والے دنوں میں کئی کئی عورتیں رضا کارانہ طور پر سوت بن کر ایک ہی مرد کے پاس رہنے کو کہیں فوقیت نہ دینے لگیں جس سے ہمیں اپنے کاروبار میں کافی خسارہ اٹھانا پڑ سکتا ہے ....؟ اور پھر اس نے شیطان کے بڑے سے کان کے نزدیک اپنے شہوت زدہ ہونٹ جلدی جلدی ہلاتے ہوئے چپکے سے کچھ کہا:

''اچھا جا بھاگ ..... ویسا ہی ہوگا۔'' اور جب وہ جانے لگا تو شیطان نے اسے بلا کر کہا'' اور سن! جا کر اسقاطِ حمل کی دوائیاں تیار کر اور اطمینان سے رہ، کاروبار کی فکر مت کر۔''

''جہاں پناہ!'' ایک بڑے چہرے والے شیطان نے آ کر کہا،'' پہاڑ، جنگل، گاؤں سے ایک باریش سقہ انسان، انسانوں کی غیر معمولی قیادت لے کر آیا ہے جو صحرا سمندر اور چٹیل میدان کی مسافت سے تھک کر چور ہے اور حضور سے ملنا چاہتا ہے۔''

''جا، اسے حاضر کر!'' شیطان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''شیطان صاحب!'' نووارد نے شیطان کو مودبانہ مخاطب کیا،'' میری درخواست ہے کہ ہماری نوجوان عورتوں کو ناجائز طریقوں سے حاملہ ہونے سے بچایا جائے اور انھیں اسقاط حمل کے لیے مجبور نہ کیا جائے کیوں کہ اس کے کثرت استعمال سے ان کے رحموں میں کینسر ہوسکتا ہے۔'' اپنی بات ختم کر کے وہ شیطان کی طرف ملتجیانہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''جا تیری بات میں نے سن لی، میں اپنے مشیر کاروں سے اس موضوع پر گفتگو کروں گا۔''

جب وہ جانے لگا تو شیطان نے بڑے چہرے والے کو بلا کر کان میں آہستہ سے کہا'' یہ انسان سچ بولتا ہے، جاؤ جا کر اسے اپنے سب سے خوبصورت تالاب کی مچھلی کھلاؤ تاکہ وہ زندگی کو سب سے حسین ترین صورت میں دیکھ سکے۔''

''اچھا حضور! اچھا جناب!'' کہتا ہوا وہ بڑا چہرے والا شیطان اسے لے کر وہاں سے رخصت ہوا۔

اس شیطان کی انتھک کوششوں کے باوجود جب وہ باریش سقہ انسان ٹس سے مس نہ ہوا اور کہنے لگا کہ دوسرے تالاب کی مچھلی خواہ تالاب کتنا ہی خوبصورت کیوں

نہ ہو اس کے حق میں حرام اور ناجائز ہے، تب اس نے اسے یکا یک بہلا پھسلا کر سب سے خوبصورت تالاب کے روبرو کھڑا کردیا۔ تالاب کے نیلے شیشوں میں جب اس کا عکس ابھرا تو وہ اس میں ڈوب چکا تھا۔ تالاب کے حبابوں پر قوسِ قزح کے ساتوں رنگ بکھر چکے تھے۔ اس نے کراہیت محسوس کرتے کرتے یکا یک مچھلی کو نگل لیا۔ بس پھر کیا تھا بدحواسی طاری ہوگئی۔ وہ دن چڑھے تک سوتا رہا اور جب نیند کھلی تو آنکھوں میں دھندلکا چھا چکا تھا۔ وہ شیطان کے حضور میں جانے کی ہمت نہیں جٹا پایا تھا۔ وہ اسی قدر شرمسار تھا جس قدر باغِ بہشت کے مکیں سب سے پہلی دفعہ گندم کھا کر خدا کے نزدیک شرمسار ہوئے تھے۔

پھر وہ باریش سقّہ انسان اس طرح بدمست ہوا کہ ہر تالاب میں ڈوبنے اور اسی سنہری مچھلی کو ڈھونڈنے لگا۔ ادھر نوجوان عورتوں کا حاملہ ہونا دن بہ دن عام ہوتا چلا گیا۔

اخبار کی ایک سرخی:

''کینسر سے مرنے والی نوجوان حاملہ عورتوں کی شرح اموات سالانہ ایک ہزار۔''

شیطان مکھوٹے کے اندر سے بے شرمی سے مسکرایا، ''مرو سوروں، تمہاری سزا یہی ہے۔''

ایک شیطان نے آکر آہستہ سے کہا، ''حضور والا! انسانوں نے تو آپس میں کشت و خون کا بازار گرم کر رکھا ہے۔''

''مرنے دو سوروں کو ... '' شیطان نے کہا، ''اور سنو! جب وہ لڑبھڑ کر بیٹھ جائیں تو جا کر ان مخصوص کتوں کے پلوں کے بیچ روٹی کے ٹکڑے پھینک دینا تاکہ ہماری آئندہ حمایت کے لیے وہ زندہ بھی رہ سکیں۔''

پھر ایک دن جب صورت حال پرامن ہوگئی تو شیطان اپنی معشوقہ چڑیل زادی کے ہمراہ اس انسانی بستی کے دورے پر گیا اور گھوم گھوم کر وہاں کے پرامن ماحول کا

معائنہ کرتا رہا۔ وہ جن گلیوں سے گزرتا، اس کے بوٹ کی چرمراہٹ سن کر مردے اپنی اپنی قبروں سے گردن نکال کر دیکھنے لگتے۔ دراصل ان کے ڈھانچوں میں اب بھی حرکت باقی تھی۔ ان کی آنکھوں کے حلقوں میں جھولتی ہوئی بجھی بجھی آنکھیں اب بھی گردش کر رہی تھیں۔

وہ ان مناظر کو دیکھ کر اپنے مکھوٹے کے اندر سے فخریہ ہنسا اور پھر سوچنے لگا، ''وہ لمبوترا شیطان، جس کی عقل گھٹنوں میں ہے، سمجھتا ہے کہ قصاب خانوں کو بند کروا کے انسانوں کی ہمدردی حاصل کر لے گا لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ موٹے ہونٹ والا گنجا شیطان اس سے کئی ہزار گنا زیادہ ہوشیار ہے۔'' وہ منھ ہی منھ بڑبڑایا ''بے وقوف، الو کہاں سے آ گیا۔''

لال دیو کے جاتے ہی سمندر کی نیلی سطح پر ہزاروں لاکھوں ننھی ننھی سپید پوش پریاں نمودار ہو گئیں۔

اس نے چڑیل زادی کے ہاتھ پر نرمی سے بوسہ دیتے ہوئے شوخی سے کہا، ''اگر تم کہو تو ان پریوں کو تمھارے قدموں پر نچھاور کر دوں۔'' لیکن اس چڑیل زادی نے بڑی متانت سے اس کے کان میں کچھ کہا اور وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

اسے دورے پر سے آئے ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے۔ وہ بڑی الجھن میں مبتلا تھا۔ وہ غصہ میں آپے سے باہر ہو رہا تھا، معاملہ دراصل یہ تھا کہ دورے سے واپسی کے دوران کچھ جھریدار چہرے والے انسانوں نے اس سے اچانک تابڑتوڑ کئی ایک سوال کر ڈالے تھے جس کے معقول جواب کی عدم موجودگی میں وہ بوکھلا سا گیا تھا اور اب تک وہ ان کی حق گوئی کو یاد کر کے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

اس نے بہت سوچنے کے بعد قدرے چیخ کر ایک لمبے ہاتھ والے شیطان کو پکارا اور اپنے باپ داداؤں کے تمام تر غیظ و غضب کو جٹا کر بولا، ''جا....'' اس نے اپنے صحن کے ایک مخصوص خطہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''جا....

جا کر اس حصہ کو چھوڑ کے بقیہ تمام پھیلے ہوئے ان پندرہ کروڑ انسانوں کی زبانیں کاٹ کر خاک میں ملا دے تا کہ وہ اپنی بے باکی اور حق گوئی کا مزا چکھ لیں۔" اس نے شدت جذبات سے اپنی مٹھیاں بھینچتے ہوئے مزید کہا، "اور وہ ہمیشہ کے لیے گونگے ہو کر رہ جائیں اور کبھی اپنے بے ہودہ حقوق کا مطالبہ مجھ سے نہ کر سکیں۔"

جب وہ لمبے ہاتھ والا شیطان جانے لگا تو اس نے جاتے ہوئے شیطان سے پھر کہا، "جا..... اور اپنے لمبے ہاتھ ہونے کا ثبوت شتاب پیش کر۔"

اخبار کی ایک سرخی:

"انسانوں میں پھیلتی ہوئی گونگے پن کی وبا، متاثرین کی تعداد دس کروڑ۔"

اب وہ قدرے مطمئن تھا ـــــ اپنے کارپردازوں کی مستعدی سے اور انسانوں کی خاموشی سے۔

کہتے ہیں اس نے اپنی چہیتی چڑیل زادی کے ایما پر مغرب کی جنت میں ایک چور دروازہ بنوا لیا تھا۔ اب وہ قابل احترام شیطانوں کو تاریکی کا معائنہ کرنے کا جھانسہ دے کر خود جنت چلا جایا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی جنت میں آمد ورفت برابر ہونے لگی تھی لیکن جلد ہی اسے حوروں کی اٹکھیلیاں راس نہ آئیں اور ایسا محسوس ہوا گویا مچھلیاں کھاتے کھاتے اچانک حلق میں کانٹا پھنس گیا ہو..... وہ بے چینی سے تڑپ رہا تھا..... اس نے پانی میں رہ کر مگرمچھ سے بیر لے لیا تھا، لہٰذا اس کے ہاتھوں سے اچانک علاء الدین کا چراغ چھن گیا، وہ بدحواس ہو گیا، اس کی آواز کھوکھلی ہو کر گنبد بے در میں بازگشت کر رہی تھی.....

آج وہ اپنے ہی باپ داداؤں کی سرزمین پر خود کو ناچار و بے بس محسوس کر رہا تھا جہاں چاروں طرف انسانوں کا اُمڈتا ہوا سیلاب ہی سیلاب تھا لیکن ایک بار پھر وہ خود کو لق و دق صحرا میں کھڑا، تنہا محسوس کر رہا تھا۔ وہ بدحواسی میں پڑا کراہ رہا تھا اور

کروڑوں ننگے، زخمی، دکھے اور جلتے ہوئے پاؤں اسے روندتے ہوئے آگے بڑھے چلے جارہے تھے۔

مجھے یقین ہے، جب بھی کوئی مورخ اس دور کی تاریخ لکھے گا تو وہ اسی شیطان سے شروع کرے گا۔ جسے بالآخر ایک طاقتور دھماکے میں، آگ کی لپلپاتی ہوئی زبان نے آن کے آن میں چاٹ کر خاکستر بنادیا ہے۔

۵

حالات کے مارے...

تعلیم مکمل ہونے کے بعد اور ملازمت ملنے سے پہلے کا زمانہ کتنا اذیت ناک ہوتا ہے۔ خورشید سوچتے سوچتے نڈھال ہوکر بستر پر دراز ہوگیا۔ اس نے آج سے چار سال پہلے ایم اے پاس کرلیا تھا۔ تب اسے ملازمت مل جانے کی کچھ امید تھی، لیکن جب وہ درخواستیں بھیج بھیج کر تھک گیا اور ہر بار انٹرویو میں جاکر چھٹ گیا تو اس نے تہیہ کرلیا کہ اب وہ پڑھائی چھوڑ دے گا اور ملازمت کے لیے کہیں درخواست نہیں بھیجے گا۔ ملک میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بے کاری، بے روزگاری، رشوت خوری، اعلیٰ افسران تک رسائی اور فرقہ وارانہ تعصب اور صوبائیت جیسے سماج کی فلاح و بہبود کی راہ میں حائل ہونے والے عناصر کی موجودگی میں، اسے بھلا نوکری کہاں سے مل سکتی تھی۔ اس نے کوئی چھوٹا سا اچھا کاروبار کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ مگر والدین کی خواہش کے آگے اسے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ ان کی خواہش کے آگے اس کی ایک نہ چلی، وہ دوبارہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے شہر

۔ حالات کے مارے تو سنبھل جاتے ہیں اکثر   احساس کے ماروں کو سنبھلتے نہیں دیکھا

بھیج دیا گیا۔ چار برس اور گزر گئے۔ گزشتہ ایک سال سے گھر سے پیسہ آنا بند ہو چکا تھا، خلیجی جنگ نے سیدھے اس کے گھر کے ہانڈی چولہے کو متاثر کیا تھا۔ اس کے بڑے بھائی اور نوشے بھائی دونوں کویت سے مہاجرین کی طرح اپنے اپنے کنبے کے ساتھ جان لے کر بھاگ آئے تھے۔ اس کے والد پہلے ہی ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ منجھلے بھائی اپنی بیوی بچے کے ساتھ الگ رہتے تھے۔ ایسی حالت میں اسے بھلا کون پیسے بھیج سکتا تھا، لیکن ایسی حالت میں اس کی بڑی آپا نے مدد کی تھی۔ اپنے اخراجات سے کچھ بچا کر وہ ہر ماہ کچھ روپے بھیج دیا کرتی تھیں، لیکن ادھر ان کی مالی حالت بھی پہلی جیسی نہیں رہ گئی تھی، دو دو بیٹیوں کی شادی کرنے کے بعد اب انھیں تیسری بیٹی کی بھی شادی کرنی تھی۔ پھر دونوں بیٹوں کو ڈاکٹر اور انجینئر بنانے کا ارمان بھی اپنی جگہ شدید اور اٹل تھا۔ ان حالات میں وہ پیسے کہاں سے بھیجتیں، پھر خورشید کی غیرت بھی گوارہ نہیں کرتی تھی کہ وہ بہن سے روپے مانگے، اس عمر میں وہ کس منھ سے اپنا خرچ مانگ سکتا تھا۔ پچھلے خط میں انھوں نے صاف لکھا تھا کہ آٹھ سو روپے تمھیں بھیج رہی ہوں اور ایک ہزار ابا اماں کے لیے۔ خورشید نے سوچا، اس عمر میں اسے تو خود کما کر والدین کو بھیجنا چاہیے تھا۔ وہ کس قدر ناکارہ ہے کہ بہن سے اپنے اخراجات کے لیے امید رکھتا ہے۔

اس نے دراز میں سے کچھ خطوط نکالے اور ایک کے بعد دیگرے پڑھنے لگا۔ پہلا خط اس سال کے شروع میں اس کے والد کے ذریعہ لکھا گیا تھا۔ خط کے ایک ایک حرف کو وہ غور سے پڑھنے لگا۔

بیٹا! تمھاری چھوٹی بہن سلطانہ اب کافی بڑی ہو چکی ہے اس کی شادی کے لیے جو بھی رشتہ آتا ہے، جہیز کے معاملے کو لے کر چھوٹ جاتا ہے۔ اب میں اس لائق کہاں ہوں کہ لاکھ دو لاکھ روپے خرچ کرسکوں، جب تھا تو تمھاری دوسری بہنوں کی شادی کردی تھی۔ مگر اب تو تمھارے بھائیوں پر موقوف ہے .... وہ بھی بے چارے

کہاں سے دیں، ان کے اپنے بیوی بچے ہیں۔ تمھاری آپا نے ممبئی میں ایک رشتہ طے کیا تھا۔ میں سلطانہ کو لے کر گیا، معلوم ہوا کہ لڑکے کی ماں کا AIIMS، دہلی میں آنکھ کا آپریشن ہونے والا ہے۔ شادی کی بات چیت کے لیے تین چار ماہ رکنا پڑے گا۔ میں لگ بھگ مہینہ بھر وہاں رہا، اتنے میں سلمیٰ کا خط آیا کہ اماں کی ناک سے بہت سا خون گرا ہے۔ ان کا بلڈ پریشر بہت بڑھ گیا تھا۔ TMH (ٹاٹا مین ہوسپٹل) میں بھرتی ہیں۔

اب تمھاری اماں اچھی ہیں، سلطانہ اور سلمیٰ کا بیٹا آصف تمھیں سلام کہتے ہیں۔

خورشید نے ڈبڈبائی آنکھوں سے خط بند کیا اور آنسو خشک کر کے دوسرا خط پڑھنے لگا۔

بیٹا! میں اچھی ہوں، تم فکر مت کرو، گھر میں سب آرام سے ہیں۔ تم اپنی پڑھائی میں دھیان دو، تمھیں جتنے پیسے کی ضرورت ہو، لکھو کہیں سے بھی بندوبست کر کے بھیج دوں گی۔ ہاں! پچھلے دنوں ذرا طبیعت خراب ہوگئی تھی، گرمی کی وجہ سے ناک سے کچھ خون آگیا تھا۔ تم اپنی صحت کا خیال رکھو گے۔ زیادہ محنت نہ کرنا، وقت پر کھانا کھالیا کرو گے اور دیر تک رات میں مت جاگنا، ورنہ فجر کی نماز قضا ہوسکتی ہے۔

فقط دعا گو، تمھاری ماں۔

یا اللہ! میری ماں کتنی بھولی ہے۔ خورشید نے خود سے سوال کیا، اسے نہیں معلوم کہ میں سب جانتا ہوں۔ وہ اپنے دکھ چھپانا چاہتی ہے، صرف اس لیے کہ کہیں مجھے تکلیف نہ پہنچے۔ خود بری طرح بیمار ہے لیکن اسے اپنی صحت سے زیادہ میری صحت کا خیال ہے۔ کاش! اس کا یہ بھرم بنا رہتا، یا خدایا! تو مجھے اس لائق بنا کہ میں ان کے کام آسکوں۔

تیسرا خط والد صاحب کا تھا، لکھا تھا۔

بیٹے! تم مجھ سے کیا پوچھتے ہو، تم خود سمجھ دار ہوگئے ہو، پارٹ ٹائم یا فل ٹائم جو

کام ملتا ہے کرو، تمھارے بھائی کا پیسہ ابھی تک نہیں آیا ہے۔ بنیا کا کافی ادھار ہوگیا تھا، تمھاری اماں نے سلطانہ کی شادی کے لیے رکھے گئے پیسے میں سے نکال کر بنیا کا ادھار چکتا کر دیا ہے۔ تمھارے منجھلے بھائی کبھی کبھار اپنی بیوی بچوں کے ساتھ آجاتے ہیں۔ اس کی حالت بھی ٹھیک نہیں ہے، اس کا بیٹا جاوید ہمیشہ بیمار رہتا ہے۔

تمھارے اسکالرشپ کا کیا ہوا ابھی تک ملا کہ نہیں؟ آل انڈیا ریڈیو میں تم نے جو ملازمت کے لیے انٹرویو دیا تھا، اس کا کیا ہوا؟ زمین کا بیعانہ ہوگیا ہے لیکن رجسٹری نہیں ہوئی ہے، ہوجاتی تو پورے پیسے مل جاتے۔ تمھاری اماں دعائیں کہتی ہیں اور بچے سلام۔

خورشید سوچنے لگا، زمین کبھی نہیں بکے گی۔ مسلم قوم کے لوگ کبھی نہیں سدھریں گے۔ کسی کی زمین خالی پڑی دیکھی کہ دس غنڈے لگ گئے اس کے پیچھے! ایک زمین کئی کئی لوگوں نے خرید بھی لی، بیچ بھی دی اور خود زمین کے مالک کو خبر تک نہیں۔ اس کی زمین پر بھی ایسا ہی مقدمہ چل رہا تھا۔ بات یہاں تک بڑھ چکی تھی کہ اس پر آئے دن گولی چلتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ زمین خالی چھوڑنا ہی نہیں چاہیے، لیکن اس کے ضعیف والد کیا کرتے، بیٹوں کو اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ گھر چھوڑ دتی ممبئی میں جابسے تھے۔ ماں باپ نے پال پوس کر بڑا کردیا۔ شادی بیاہ ہوگیا تو اپنا گھر دوار الگ بسانے چلے گئے۔ انھیں کیا فائدہ ہوا، آدمی درخت لگاتا ہے پھل کھانے کے لیے لیکن یہاں تو ذرا بال و پر نکلے اور چڑیا کی طرح پھر سے اڑ گئے۔ بچہ جب تک چھوٹا ہوتا ہے لخت جگر اور آنکھوں کا تارا ہوتا ہے لیکن جب والدین بوڑھے ہوجائیں تو وہ نہ آنکھوں کا نور ہوتا ہے اور نہ بڑھاپے کی لاٹھی، مادّی آسائش اور کیریئر کے چکر. وہ ماں باپ کو بے سہارا چھوڑ کر الگ ہوجاتے ہیں۔ شادی کے بعد بیٹا خود کو ہیرو اور بیوی کو محبوبہ سمجھنے لگتا ہے۔ اس کے رومان انگیز شیش محل میں جھری پڑے اور سفید بالوں والے ماں باپ کانٹے کی طرح کھٹکنے لگتے

ہیں۔ کیا ایسا کرنا مناسب ہے ہرگز نہیں، لیکن اس کے گھر کا ماحول ایسا ہرگز نہیں تھا۔ اس کے بھائی مثالی بھائی تھے۔ محلے کے لوگ اور رشتے دار ان کی مثالیں دیا کرتے تھے، مگر محلے کا ماحول ٹھیک نہیں تھا۔ اچھے اسکول اور ہیلتھ کلینک نہیں تھے۔ گھر میں بجلی کمزور تھی کمروں میں زرد سی مدھم روشنی رہا کرتی تھی۔ کھپریل مکان میں چھت سے گرد بہت گرا کرتی تھی، کنویں کا پانی بہت گندا تھا، غسل خانہ وغیرہ پرانے طرز کے تھے۔ ان میں فلش کا انتظام نہیں تھا۔ دن کے وقت بجلی اتنی کٹتی تھی کہ ٹی وی پر کوئی اچھا پروگرام نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ وی سی پی اور وی سی آر کی بات تو دور رہی۔ گھر کے نزدیک کوئی پارک نہیں، کوئی گارڈن نہیں، کوئی اچھا ہوٹل نہیں تھا۔ مسجد اتنی نزدیک تھی کہ ہر وقت اذان کی تیز آوازیں آتی رہتی تھیں، خاص طور سے جمعہ کے دن تو بردوان کے سنّی مولوی صاحب گلا پھاڑ پھاڑ کر بنگلہ لہجے میں تقریر کیا کرتے تھے۔ محلے کی سڑکیں ایسی اونچی نیچی اور ٹوٹی پھوٹی تھیں کہ ہمیشہ اسکوٹر کے ٹائر ٹیوب خراب ہوجایا کرتے تھے۔ بھلا ایسے حالات میں وہ اگر الگ مکان بنواکر چلے گئے تو کیا برا کیا۔ وہاں مضبوط کھڑکیاں اور دروازے تھے، مضبوط اور خوش نما گرل تھے، دیواروں پر خوش رنگ ڈسٹیمپر تھا۔ وہاں آزادانہ ان کے دوست اور پھر ان کی بیوی کے طالب علمی کے زمانے کے دوست آجاسکتے تھے۔ آخر آدمی شادی بیاہ کیوں کرتا ہے، اسی لیے ناکہ وہ جیسے جی چاہے آزادی سے زندگی گزار سکے۔ رہ گئے ماں باپ تو انھیں ہر ماہ کھانے کے پیسے بھیج دیا کریں گے۔

خورشید نے ایک اور پرانا خط نکالا۔

بیٹا! مجھ سے اب سائیکل چلتی نہیں ہے۔ چشمہ کا شیشہ بھی گر کر ٹوٹ گیا ہے، آصف کو اسکول لے جانا اور اسے ہوم ورک کرانا، یہ کام بھی اب مجھ سے نہیں ہو پاتا ہے۔ اس برسات میں پچھواڑے کی کچی دیوار بھی گر گئی ہے، لکڑی والا بجلی کا کھمبا

دیمک کھاجانے کی وجہ سے گر گیا ہے، اس سال چھت کی شہتیر بھی ٹوٹ گئی ہے اسے بدلوانا ضروری ہے۔ تم جیسے بھی ہو سکے پڑھائی کے ساتھ کچھ کام بھی کرنے کی کوشش کرو۔

خورشید کا سوچتے سوچتے سر دکھنے لگا۔ ایک خیال آیا، سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہ گھر چلا جائے، لیکن گھر جا کر وہ کرے گا کیا، چھوٹا سا قصبہ ہے، محلے ٹولے کے لوگ سوچتے ہوں گے خورشید بڑا افسر بن کر آئے گا۔ وہ وہاں جا کر کون سا کام کرے گا، کم پڑھے لکھے اس سے پوچھیں گے کہ وہ ایس پی بن کر آیا ہے یا کلکٹر بن کر، تو وہ انھیں کیا جواب دے گا، کیا وہ ان سے جھوٹ بول سکے گا۔ پھر جھوٹ کب تک چھپا رہ سکتا ہے، ایک دن انھیں معلوم ہو ہی جائے گا، پھر وہ وہاں جا کر ہاتھ پر ہاتھ دے کر بیٹھا تو نہیں رہے گا، آخر کیا کرے گا۔ اسے یاد آیا ایم اے پاس کرنے کے بعد جب اس نے اپنے والد سے کہا تھا کہ اگر ہائی اسکول کے ٹیچر کی بھی نوکری ملتی ہے تو وہ کرنے کو تیار ہے۔ اس وقت اس کے بوڑھے والد کا چہرہ کتنا اتر گیا تھا، جیسے وہ اتنا پڑھ لکھ لینے کے بعد ایسی ادنیٰ ملازمت کی امید نہیں کرتے تھے۔ وہ اندر ہی اندر کانپ اٹھا تھا، یا اللہ! انھیں معلوم ہی نہیں ہے کہ ملک میں کس قدر بے روزگاری ہے۔ اردو سے ایم اے کرنے کے بعد بھی ہائی اسکول کی ٹیچری مل جائے تو غنیمت ہے۔ پھر اس کی تنخواہ بھی بری نہیں ہوتی ہے۔ اس نے دل میں ٹھان لیا کہ وہ دلی ہی میں رہ کر جز وقتی طور پر ملازمت کرے گا اور پڑھائی بھی جاری رکھے گا۔ لیکن اگر کوئی سازگار موقع ملا تو اپنا چھوٹا سا کاروبار شروع کردے گا۔ اسے ملازمت سے کوفت ہوتی تھی۔ وہی بندھا ٹکا مشاہرہ اور بڑھتی ہوئی مہنگائی۔ پھر بچے ہوں گے، خاندان بڑھے گا۔ وہ اپنے دیگر بھائیوں کی طرح الگ نہیں ہوگا۔ وہ اپنے بوڑھے ماں باپ اور چھوٹے بھائی بہنوں کو اپنے ساتھ رکھے گا، اس لیے وہ ایسا کاروبار کرے گا جس میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی رہے اور آمدنی میں ہر دم اضافہ

ہوتا رہے تا کہ بہتر اور خوش حال زندگی بسر کر سکے اور اس کے بچے جب بڑے ہو جائیں تو انھیں بھی الگ ہونے کی ضرورت نہ پڑے۔ اگر الگ ہوئے بھی تو وہ بھی تو ریٹائر نہیں ہوگا۔اس کا تو اپنا کاروبار ہوگا، جب تک جی چاہے نوکر چاکر رکھ کر تجارت کر سکتا ہے۔

اس نے آخری خط کھولا، یہ پچھلے ہفتے آیا تھا، لکھا تھا۔

سلطانہ کی شادی کے لیے ہو سکے تو کچھ کرو، تمھارے بھائیوں کو کیا ہے، ان کی شادی ہوگئی، اب کسی سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ پتہ نہیں اس کی قسمت میں کیا ہے، کیا خدا نے اس کا جوڑا بنایا نہیں ہے؟ جب بھی رشتے کی بات چلتی ہے کٹ جاتی ہے، ایک رانچی کا لڑکا ہے، زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہے، خاندان بھی معمولی ہے بس اتنا ہے کہ ٹاٹا کمپنی میں کام کرتا ہے، وہ لوگ بہت دنوں سے لگے ہوئے تھے لیکن جب ہم تیار ہو گئے تو ایک لاکھ روپے مانگ رہے ہیں۔ اتنا ہی پیسہ ہوتا تو ہم اچھے خاندان میں نہیں کر لیتے۔

خورشید نے حساب لگایا اس کی عمر تیس سال ہو چکی تھی اور سلطانہ اس سے چار سال چھوٹی تھی۔ اس کی پیٹھ کی چھوٹی بہن کی شادی ہو چکی تھی، وہ چار بچوں کی ماں تھی، وہ سوچنے لگا اب مجھے بھی کسی طرح شادی کر لینی چاہیے کیوں نہ ہم گولٹا شادی کرلیں، خالہ کی لڑکی بانو زیادہ پڑھی لکھی نہ سہی دیہاتی سہی اگر میں اس سے شادی کرلوں تو کیا عمران سلطانہ سے شادی کرنے کو تیار نہ ہوگا؟ عمران بھی تو اچھی ملازمت کرتا ہے لیکن اسے دفعتاً یاد آیا، وہ کس بوتے پر شادی کرے گا، وہ تو کچھ کام بھی نہیں کرتا ہے، عمران زیادہ پڑھا نہیں لیکن اس سے بہتر ہے کم از کم بیوی بچوں کو پال تو سکتا ہے، وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا، پھر یکا یک اسے ماموں کی بیٹی شگفتہ کا خیال آیا۔ وہ آج سے دو سال پہلے بی اے آنرز کر رہی تھی، اس کی شادی بھی نہیں ہوئی ہے۔ رنگ بھی صاف ہے بس ایک قد ذرا پستہ ہے، اگر میں تیار ہو جاؤں تو

شمیم سے سلطانہ کی شادی ہوسکتی ہے۔ شمیم میں کیا برائی ہے صرف دائیں ہاتھ میں دو انگلیاں کم ہیں، رنگ ذرا سانولا ہے، ہاں البتہ وہ بے روزگار ہے کوئی مستقل کام نہیں کرتا۔ اماں نہیں مانیں گی، ورنہ میں تو اپنی بہن سلطانہ کے لیے شگفتہ جیسی پستہ قد لڑکی سے بھی شادی کرنے کو تیار ہوں، کچھ ہو یا نہ ہو اتنا تو ضرور ہوگا کہ خاندان اچھا مل جائے گا۔ دو خاندان کے لوگ پھر ایک جگہ ہو جائیں گے اور لین دین کا کوئی دباؤ بھی نہیں ہوگا۔

خورشید نے اٹھ کر سگریٹ سلگائی، ایک بھرپور کش کھینچا اور پھر دھوئیں کے مرغولے سے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ اس کی کنپٹیوں کے ابھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے سفید مٹیالے رنگ کے بال بلب کی روشنی میں چمک رہے تھے، پیشانی پر سے دور تک بال جھڑ چکے تھے، اسے اپنے والد کا چہرہ یاد آگیا، ان سے جدا ہوتے وقت یاس بھری آنکھوں میں کتنی امیدیں تڑپ رہی تھیں۔ جھریوں کے جال میں چہرہ اٹا ہوا تھا۔ بالوں کی سفیدی چہرے کی ویرانی میں اضافہ کر رہی تھی۔ اماں کتنی بوڑھی ہو چکی تھیں، اماں کے دانت اور ابا کے بھی دانت ٹوٹ چکے ہیں۔ اماں کا جسم تو یکایک بالکل کمزور ہو گیا تھا، اماں کو غور سے دیکھنے کے بعد رونا آتا تھا۔ اک دم ضعیف سی ہوگئی تھیں لیکن کام اسی طرح سارا کرتی تھیں۔ سلطانہ کے چہرے سے بھی شگفتگی کافور ہوتی جارہی تھی۔ آصف کا بیمار دبلا پتلا بدن اس کے ذہن میں رینگ گیا۔ وہ کتنا کمزور ہو گیا تھا، اتنی ساری انگریزی اسکول کی کتابیں پڑھتا تھا اور کھانے میں اسے صرف چائے اور روٹی ہی ملتی تھی، سوچتے سوچتے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ وہ ہوٹل کے کمرہ میں تنہا پڑا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کی جوانی آخر کس کام کی ہے۔ آخر وہ کس دن کمائے گا اور کس کے لیے، گھر کی بربادی میں اب کون سی کسر باقی رہ گئی ہے۔ محلے کے لوگ میرے اور میرے بھائیوں کے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے، گھر

کی عزت نیلام ہونے والی ہے اور ہم بے فکر بوڑھے اور بے سہارا ماں باپ کو چھوڑ کر اپنے کیریئر بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔ ایسا کیریئر کس کام کا، انسان کس کے لیے کماتا ہے، جب کوئی دیکھنے اور کھانے والا ہی نہیں رہے گا تو ایسی دولت اور شہرت کس کام کی؟

..... اور نہ جانے کب اسے نیند آگئی، صبح تکیہ آنسوؤں سے تر تھا۔ اس نے جلدی جلدی کچھ ضروری سامان سوٹ کیس میں رکھا اور کچھ کرنے کا عزم لے کر کمرے سے نکل پڑا۔

۶

قصہ گو کی تراجدی

اچانک ایک شام لوگ باگ نے دیکھا، نافِ شہر میں کسی جگہ اونچے چبوترے پر ایک بورڈ پر دو سطریں جلی حروف میں لکھی ہوئی تھیں اور اس کے سامنے ایک چراغ روشن تھا۔

یہ ایک پندرہ سو سال پرانی اور طویل رات ہے، جب کہ
سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔

کسی میں اتنی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ بڑھ کر اس بورڈ کو ہٹا دے یا پلٹ دے۔ ہر آدمی یوں محسوس کرتا، گویا کوئی اسے دیکھ رہا ہے اور آگے بڑھتے ہی سنسناتی ہوئی گولی کا نشانہ بن جائے گا۔ لوگ باگ سہمے سہمے اسے دیکھتے، اور اندر ہی اندر سسکتے بلکتے اور آنسو پی کر رہ جاتے۔ حتیٰ کہ کسی میں اظہارِ رنج وغم کی سکت باقی نہ تھی۔

مہذب اور کمزور آدمی کا دل ان سطور کا آخری لفظ پڑھتے ہی وہاں سے .... پانی ہوجاتا۔

بات دراصل یہ تھی کہ کچھ شرپسند عناصر نے سورج کے نگہبانوں کو اپنی مکروہ طاقت کے بوتے پر بن باس کو روانہ کردیا تھا۔ جہاں انھیں صرف جنگلوں کو دیکھنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ وہ اس کے متعلق ایک لفظ بھی بول نہیں سکتے تھے۔

چنانچہ وہ دن بہ دن گدلانے لگا، پھر اس پر سیاہی کی گرد جمنے لگی کہ خلقت اپنی کالک اسی کی پیٹھ پر پونچھنے لگی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اتنا گدلا گیا کہ اس کا اجالا معدوم ہوگیا۔ اب ہر جگہ فضا مکدر اور تاریک تھی۔

لیکن یہ سب کیسے اور کب ہوگیا، کسی کو علم نہ تھا اور نہ کسی کو یہ سب سوچنے کی فرصت تھی۔

پھر ایک منحوس گھڑی انھوں نے دیکھا، گیہوں کا کوئی شاداب اور لہلہاتا ہوا کھیت نذرِ آتش کردیا گیا تھا۔

اس واقعے کے بعد سے نفوس میں اپنے ہونٹ سی لینے کی شیطانی اور مجرمانہ وَبا تیزی سے سرایت کرنے لگی۔ کوئی آنکھ بھی اتنی ہمت نہیں جٹا پاتی تھی کہ آتش زدہ کھیت کا پورا منظر اپنے آئینے میں سمیٹ سکے۔ عالم عالم اپنے کندھوں اور سروں پر پرندہ بٹھا کر پہروں خلاؤں میں گھورتا رہتا۔ انجماد اور سکوت پورے ماحول پر چھانے لگا تھا۔

ابھی اس کا غم اہلِ زمین بھول بھی نہ پائے تھے کہ کوئی دوسرا سنہری بالوں والا کھیت جلا ڈالا گیا۔

لیکن اب بھی لوگوں میں خود کو بُت بنا لینے کا فن کسی مقدس روایت کی طرح جاری رہا۔

پھر تو تابڑ توڑ کئی ہرے بھرے لہلہاتے ہوئے شاداب کھیت یکے بعد دیگرے جلائے جانے لگے۔

اب پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ دلوں کی بھٹیوں میں اضطراب اور بے چینی کا

لاوا پکنے لگا۔ لوگ باگ کا ایک سمندر تھا جو تخلیق شوریدہ سری کا کرب اپنے اندر سمیٹے ضبط وسکوت کا خاموش پیکر بنا ہوا تھا۔ واقعی عدم احتجاج کی کیفیت ایسی ہی تھی۔

روز صبح کسی آتش زدہ کھیت کے منظر کو اخبار سے گھونٹ گھونٹ اپنے اندر چائے کے ساتھ اتارنا معمول بن چکا تھا۔

اچانک یہ خبر بھوپال کی زہریلی گیس کی طرح پورے شہر میں پھیل گئی کہ سورج کا ایک نگہبان جنگل سے فرار ہونے میں کسی طرح کامیاب ہو چکا ہے۔

افواہ تو یہاں تک لوگ باگ میں معتبر ہوتی جارہی تھی کہ اس رات اس کا حاصلِ زندگی کھیت جلایا جانے والا تھا۔ اور یہ خبر چپکے سے کسی نے اس کے کانوں تک پہنچا دی تھی۔

لیکن اخباروں میں جو اس نے بیان دیا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خود فرار نہیں ہوا تھا بلکہ کسی نے اسے فرار ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

> میں اگر یہ بتادوں کہ مجھے فرار ہونے پر کس نے مجبور کیا تھا تو شاید میرے اس دوست کے حق میں بہتر نہیں ہوگا جس نے مجھے فرار ہونے پر مجبور کیا تھا۔

(اتوار ایڈیشن: خبر نامہ وقت، پہلا صفحہ)

اس بیان کے منظرِ عام پر آتے ہی، پھر تو اخبار و رسائل کے نامہ نگاروں کا تانتا سا بندھ گیا۔

ہر نامہ نگار اپنے مختلف زاویوں سے حقیقت اُگلوانے کے لیے سوال کیے جارہا تھا۔ جن کا وہ متانت کے ساتھ جواب دے رہا تھا۔

بالآخر لوگ باگ نے فیصلہ یہ کیا کہ سب سے پہلے ان ریچھوں کے ٹھکانوں کا پتہ لگایا جائے جہاں وہ سب رات بھر کھیت جلانے کے بعد جا کر دن بھر سویا کرتے ہیں۔

لیکن بقول انجان بورڈ اور چراغ والا، اس پندرہ سو سال پرانی اور طویل رات

میں جبکہ سورج طلوع نہیں ہوا تھا، ان ریچھوں کے ٹھکانوں کا سراغ لگانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

ماحول اتنا مکدر ہو چکا تھا کہ کوئی شے اپنی اصلی حالت میں نظر نہیں آتی تھی ——— چہار دِشا میں پھیلے ہوئے لوگ جب ہانپتے کانپتے 'افتاں و خیزاں' زخمی اور لہولہان ہو کر آتے تو ان ریچھوں کے ٹھکانوں کا معمہ کسی سے حل نہیں ہو سکا تھا، ہاں! البتہ وہ اپنے ساتھ ترکیب و مشورہ ضرور لے کر آئے تھے بلکہ انھیں ترکیب و مشورہ کی بجائے قیاس محض کہنا زیادہ مناسب ہوگا جیسے:

''وہ خونخوار ریچھ پہاڑ کے اس پار سے آتے ہیں۔''

''نہیں، نہیں، میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ دور تک ریگستان میں ان کے قدموں کے نشان پائے گئے ہیں۔ وہ صحراؤں اور ریگستانوں کو پار کر کے آتے ہیں۔ وہ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں کی شکل میں آتے ہیں۔''

''میں بتاتا ہوں، گھنے جنگلوں کے بیچ سے ایک پتلی سی راہ جاتی ہے۔ اسی راستے پر جابجا ان کے نقش ہائے پا دیکھے گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ اسی جنگل کے دوسرے سرے میں اپنے ٹھکانے آباد کیے ہوں۔ اے میرے فریاد رس! سراغ رساں کتے ہمارے ساتھ کیے جائیں تا کہ ان کی کھوج میں آسانی پیدا ہو۔''

''نہیں بھئی نہیں، میں نے تو اپنے کھیتوں کی رکھوالی کے دنوں میں دیکھا ہے وہ سرنگ کے ذریعے منتخب کھیت کے سامنے نمودار ہو جاتے ہیں ——— ہم لوگوں نے آتش زدہ کھیت کے نزدیک سرنگ کے نشانات دیکھے ہیں۔''

''صاحبو! یقین جانو! میں نے تو آسمان سے ہیلی کاپٹر کے ذریعے اترنے کی آوازیں سنی ہیں۔ یقین کرو کہ وہ آسمان سے آتے ہوں گے۔ اے مخاطب! ہمیں دوربین اور وائرلیس دو تا کہ اس کی آمد سے پہلے ہم اپنے کھیت کی حفاظت کے سامان مہیا کر سکیں۔''

"پیارے لوگو! تم میں سے ہر ایک کی بات سچ ہے لیکن آدھا ادھورا سچ ـــــ بات دراصل یہ ہے کہ ...."

اس نے نافِ شہر میں جمع مجمع پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد اس بورڈ جس پر یہ تحریر تھا۔

"یہ ایک پندرہ سو سال پرانی اور طویل رات ہے جبکہ سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔"

دونوں ہاتھ بچھا کر اپنی ٹھوڑی رکھ کر کہنا شروع کیا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ مجرم خواہ کوئی بھی ہو، اتنی ذہانت اور ہوشیاری سے کام کر جاتا ہے کہ جائے واردات پر اپنی کوئی نشانی نہیں چھوڑتا۔ جس سے کہ اس کے سراغ رسانی کا کام شروع کیا جا سکے۔"

بلاشبہ ان کے پاس ایسی ننھی ننھی جدید الکٹرانک مشینیں موجود ہیں جو جائے واردات کی تمام وائرلیسوں کی قوت کو معطل کر دیتی ہیں۔ اس طرح وہ اپنا کام بڑی صفائی سے کر جاتے ہیں، یا پھر وہ جائے واردات کے قرب و جوار کے تمام سراغ رساں کتوں کو پہلے ہی کڈنیپ کر کے اپنی تحویل میں لے لیتے ہیں۔

"اے پیارے لوگو! اس رات جبکہ میں فرار ہونے پر مجبور کر دیا گیا تھا، بخدا میں نے اپنے عقبی دروازے کی پھاٹ سے دیکھا تھا، وہ گنتی میں غالباً سات رہے ہوں گے۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ سات ہی تھے کہ ان کی شکل و شباہت اور اطوار ایک دوسرے سے بے حد ملتے جلتے تھے۔ البتہ، اس طرح کہنے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے۔ وہ مٹھی بھر تھے، اور وہ چاندنی میں نہاتا ہوا لہلہاتا، مست اور شاداب کھیت، جس کے سنہری خوشوں میں دودھ پکنے لگا تھا، ان کے دام حلقہ میں آتے ہی ایک دم لہک اُٹھا۔ شعلہ شعلہ وہ کھیت جلنے لگا۔ اس کے گرد جمع ریچھوں نے روشن خوشوں کو اپنے خونخوار پنجوں سے نوچنا کھسوٹنا شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے گیہوں کا وہ کھیت جلنے لگا، وہ جلتا رہا، حتیٰ کہ کھیت کی آخری چنگاری بھی سرد ہو گئی۔"

''آہ! اس گیہوں کے کھیت کا دھواں، اس کے جلنے کی تیز بو آج بھی میرے نتھنوں کو پھاڑے دی رہی ہیں۔
چشمِ زدن میں وہ ہنستا، لہلہاتا، کھیت راکھ کے ڈھیر میں بدل دیا گیا تھا، لوگو! تم جانتے ہو وہ مٹھی بھر کون تھے ——— ؟؟

وہ کوئی پہاڑ، جنگل، ریگستان، سرنگ یا آسمان میں سے آتے ہیں اور نہ وہاں کے باشی ہیں۔ بلکہ وہ یہیں اور اس وقت ہمارے اندر موجود ہیں۔''
''تم جانتے ہو، میرا دوست جو مجھے فرار ہونے کے لیے مجبور کرنے پر کامیاب ہوگیا تھا، وہ ماہر جرائم ہے۔ اس نے جلے ہوئے گیہوں کے کھیت پر ثبت شدہ انگلیوں کے نشانات جمع کر لیے تھے۔ میں اگر ان مٹھی بھر ریچھ کی کھالوں کو آپ کو دکھا دوں تو آپ پاگل ہو جاؤ گے۔''

پورے مجمع پر سکوت طاری تھا ——— پن ڈراپ خاموشی!

معزز لوگو! اگر میں چاہوں تو ممکنہ حد تک انگلی پر ان کے نام گنوا سکتا ہوں۔ حتیٰ کہ ان کے شعبہ جات بتا سکتا ہوں۔ لیکن میں نہیں چاہتا کہ ایک سنسناتی ہوئی گولی کا نشانہ بن کر آپ کے قصہ گو کو ہمیشہ کی نیند سلا دوں، کیونکہ اگر آپ کا قصہ گو مرجائے گا تو پھر ان کی نئی کھال لانے کے بعد کا قصہ کون سنائے گا؟

شال باف کی بیٹی

چھوٹی بڑی پہاڑیوں سے گھرے چناروں کے جنگل اور زعفران کے کھیتوں سے لگ کر ایک شانت اور شفاف پانی کی جھیل کی سطح پر ایک معمولی سا شکارا دھیرے دھیرے آگے کی اور بڑھ رہا ہے۔ ایک نحیف بڈھے عبدالکریم کے دو جھری دار مشاق ہاتھ دھیمے اور غم آگیں آہنگ کے ساتھ چپوؤں سے شکارہ کھے رہے ہیں۔

''یہ ہاتھ جو کبھی کتنے مضبوط تھے''، عبدالکریم نے سوچا، ''ان ہاتھوں سے کبھی انگریزی سامراجیت کے خلاف نہ جانے کتنی بار میں نے نعرۂ احتجاج بلند کیے تھے۔ ان کے خلاف لاٹھی بھی اٹھائی تھی۔ یہ ہاتھ جو کبھی غلام تھے یہی ہاتھ بھارت کی آزادی کے علمبردار تھے۔ لیکن اب یہ ہاتھ کتنے کمزور معلوم ہوتے ہیں، شاید آج ان ہاتھوں کی اب کسی کو ضرورت نہیں ——— کیونکہ اب بھارت آزاد ہو چکا ہے۔ پہلے پاکستان بنا پھر بنگلہ دیش۔ اب ہر شخص آزاد ہے۔'' اس نے موجودہ صورت حال پر کچھ دیر سوچا لیکن جلد ہی اکتا کر زیر لب بڑبڑایا ''نہیں نہیں ان سب کے باوجود میرا بھارت مہان ہے۔'' شکارہ اب بھی جھیل میں لہریں پیدا کرتا ہوا

دھیرے دھیرے آگے کی اور بڑھ رہا ہے۔ اس کے جھری پڑے چہرے پہ متحرک جہاں دیدہ آنکھیں دور ـــــ آنے والے لمحوں کے لیے ـــــ دھند میں کھوئے ہوئے مناظر میں اپنا رستہ ڈھونڈ رہی ہیں اور دماغ کسی خود کار مشین کی طرح متواتر بوقلموں سوچ وفکر میں منہمک ہے۔

اس کی بیٹی جوان ہو چکی ہے، لیکن اس کی شادی کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ آج وہ اس علاقے کا سب سے پرانا اور سب سے اچھا کاریگر ہے۔ اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی شال اور پشمینے کی اس علاقے میں دھوم ہے۔ دور دور تک اس کی شہرت ہے۔ اتنی مانگ ہے کہ وہ پوری نہیں کر پاتا ہے لیکن .... اسے اس کا محنتانہ کیا ملتا ہے؟ کچھ بھی نہیں! جب سے کمیشن خور اس دھندے میں داخل ہوئے ہیں اس کا دھندا ہی مندا پڑ گیا ہے۔ وہ اس علاقے کا سب سے اچھا شال باف ہوتے ہوئے بھی شہر سے دور پہاڑیوں پر بلکہ جنگل میں رہتا ہے جبکہ کمیشن خور جو کل تک کچھ بھی نہیں تھے آج شہر کے عالی شان مکانوں میں رہتے ہیں۔ وہ منہ ہی منہ بڑبڑایا۔ .... ''ہاں اتنا ضرور ہے کہ یہ کمیشن خور نہ ہوں تو ہمارا پرسان حال کون ہے؟ یہ اگر ہمیں وقت بے وقت آڑے دنوں میں قرض نہ دیں تو ہم تو مر ہی جائیں ....''

اسے اپنے گزرے ہوئے دن یاد آنے لگے۔

پچھلے دنوں جب وہ آج سے دو سال پہلے رمضان میں بیمار پڑا تھا تو جتنی جمع پونجی تھی جو اس کی بیوی نے پیٹ کاٹ کر اپنی بیٹی کی شادی کے لیے جمع کر رکھی تھی، سبھی اس کی بیماری میں خرچ ہوگئی۔ اس کے جوان بیٹے یوسف علی نے کتنی دوڑ دھوپ کر کے اسے موت کے منہ سے نکالا تھا۔ اس کی یوسف سے بڑی امیدیں بندھی ہوئی تھیں، لیکن ....

یوسف کی یاد آتے ہی یکایک عبدالکریم کی بے چینی بڑھنے لگی، سوچتے سوچتے کلیجہ منہ کو آتا ہوا محسوس ہوا۔ ماتھے پر پسینے آنے لگے، بوڑھی آنکھوں میں

یوسف کی یاد کے آنسو آتے ہی سارا منظر دھند میں کھو گیا۔ لیکن چپوؤں پر ہاتھوں کی گرفت اب بھی مضبوط تھی۔ نہ جانے کیوں آج وہ جلد سے جلد گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اس کا دل بری طرح گھبرا رہا تھا۔

آج سے ٹھیک ڈیڑھ سال پہلے جب وہ پوری طرح بیماری سے اٹھ بھی نہ پایا تھا کہ اس کے اکلوتے جوان بیٹے کی ناگہانی موت نے اس کی کمر توڑ دی تھی۔ یوسف علی کے کچھ ساتھی جو ایک ساتھ کھیلے کودے اور پلے بڑھے تھے ایک دہشت پسند گروہ میں شامل ہو گئے تھے۔ وہ سب گزشتہ چھ سات مہینوں سے اسے اپنے گروہ میں شامل ہونے کے لیے طرح طرح سے اکسا رہے تھے۔ پہلے تو انھوں نے دعوت دی پھر ایک بندوق اور کچھ کارتوس دے گئے، لیکن یوسف میرے لال، میرے پیارے بیٹے کا حب وطن سے لبریز ضمیر اسے اس بات کی کبھی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ ان بندوقوں کی نوک پر مادر وطن کو ٹکڑوں میں تبدیل کردے۔ اسے ان دہشت پسندوں نے کئی بار دھمکیاں بھی دیں، لیکن وہ ایک وطن پرست باپ، عبدالکریم کا بہادر بیٹا تھا، اس کے پائے استقلال میں ذرا بھی لغزش نہیں ہوئی تو آخرکار دعوت عداوت میں بدل گئی۔

ایک منحوس شام، جب ہلکی ہلکی برف باری ہو رہی تھی چاروں طرف دھند کی ایک دیوار سی بن گئی تھی۔ اچانک اس دیوار کے پیچھے سے ان دہشت پسندوں کا ایک شیطانی غول نمودار ہوا۔ ان لوگوں نے یوسف علی کو اپنے حصار میں لے لیا اور پھر اس پر اس وقت تک کوڑے برساتے رہے جب تک کہ وہ بے ہوش نہیں ہو گیا۔

یوسف علی کی موت انسانی تاریخ کا وہ المناک لمحہ ہے جس کے تقدس اور عظمت کو سمیٹتے ہوئے تاریخ کے اوراق بھی لرز اٹھیں گے۔

اس کی مجبور اور بے بس ماں اور بہن اسے درندوں کے چنگل سے چھڑانے کی ناکام کوششیں کر رہی تھیں اور وہ ـــــــ اس کا کمزور اور بیمار باپ ـــــــ بستر

پر درد سے کراہ رہا تھا۔ آخرکار ان وحشیوں کا سرغنہ اس کے اپنے بچپن کے دوست نے سیاسی آسیب کی زد میں آکر اپنے دوست کے سینے کو خنجر سے لہولہان کر دیا۔ وہ تڑپ رہا تھا.....

"غدّار! دھوکے باز! تو نے ہمارا نام مٹی میں ملا دیا۔ تو، میرا دوست بننے کے قابل نہیں ....."

مرتے وقت بھی یوسف علی کی زبان پر صرف ایک ہی دلدوز جملہ تھا۔

"میرا بھارت مہان!"

حتیٰ کہ آخر آخر وقت تک اس کے ارادوں میں کوئی فرق نہیں آیا تھا اور وہ کوڑے کی ہر زد پر یہی دہراتا رہا تھا۔

"میں ایک محبِّ وطن کی اولاد ہوں۔

میں وطن فروش نہیں!

قسم ہے مجھے اپنے باپ ـــــــ مجاہد آزادی ـــــــ عبدالکریم کی،

میں سرفروش تو ہوں ضمیر فروش نہیں۔

میں ہزار جان سے اپنے مادر وطن پر قربان ہو سکتا ہوں۔

لیکن وطن سے غداری میرا شیوہ نہیں۔"

شکارا کنارے پر آچکا تھا، وہ چپو کے سہارے زمین پر آیا۔ تھکا ہارا وہ دو چار قدم آگے بڑھا لیکن اپنے آگے سے تیزی سے بھاگتے ہوئے ایک سیاہ ناگ کو دیکھ کر وہ دم بھر کو وہیں ٹھٹک گیا۔ اس سے پہلے اس علاقے میں کبھی سیاہ ناگ دیکھا نہیں گیا تھا۔ اس نے سوچا، "یہ تو واقعی بڑا خطرناک ہے، اس کی اس علاقے میں موجودگی کسی کے لیے بھی جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے۔" لیکن اب اس کے نحیف ہاتھوں میں اتنی طاقت کہاں تھی کہ وہ آنے والے زہریلے سانپ کا رخ اکیلے موڑ سکے۔ وہ جوان بیٹے کی موت کے بعد سے بالکل ٹوٹ چکا تھا۔ اس نے اپنی کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر

خود کو قدرے سیدھا کھڑا کیا اور تیس چالیس قدم اوپر اونچائی پر بنے مکان کو مایوسی بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

آزادی کے چالیس سال بعد ملک کہاں سے کہاں نکل گیا، دنیا کتنی ترقی کر گئی۔ اس کے کچھ ساتھی پاکستان چلے گئے کچھ وہاں سے بھی ہجرت کر کے لندن اور امریکہ پہنچ گئے۔ لیکن آج تک وہ اپنے آبا و اجداد کے اسی شکستہ مکان میں رہتا ہے۔ پچھلے کئی برسوں سے اس نے مکان کی مرمت کا ارادہ کیا تھا لیکن ہر بار کوئی نہ کوئی بات آڑے آجاتی تھی۔ یوسف کی موت کے بعد تو اس کی اس طرف سے توجہ ہی ہٹ گئی۔ اب تو اسے صرف ایک ہی فکر لاحق تھی کسی طرح اس کی پیاری بٹیا کی شادی ہو جائے کیونکہ اب وہ پوری طرح سیانی ہو چکی تھی۔ معاً وہ کانپ اٹھا، چار فوجی جوان اس کے گھر سے نکل کر اپنی بندوقیں سیدھی کرتے ہوئے تیز تیز قدموں سے بھاگے جا رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر عبدالکریم کا بوڑھا دماغ دفعتاً شل ہو گیا۔ جیسے کوئی بجلی سی کوند گئی جیسے بجھنے سے پہلے چراغ کی لو یکا یک چمک کر سرد ہو جاتی ہے۔ کیونکہ گزشتہ چند برسوں سے وادی میں آئے دن اس طرح کے واقعات ہوتے رہتے تھے۔

اب نہ عبدالکریم کی آنکھوں میں نور تھا نہ کمر میں طاقت اور نہ دماغ میں سوچنے کی سکت۔ وہ کسی طرح افتاں و خیزاں مکان میں داخل ہوا تو بالکل ششدر اور حیران رہ گیا۔ اس کی جوان بیٹی مغفرت کا پھول جیسا جسم ٹھنڈے فرش پر نیم برہنہ حالت میں پڑا ہوا تھا۔ شانوں پر زلف کی سیاہی بکھری ہوئی تھی۔ سفید دوپٹہ منھ پر بندھا ہوا تھا اور تار تار کپڑوں سے جھانکتے ہوئے تازہ نوچ کھرونچ کے نشانات اوج وحشت و درندگی کی غم انگیز سرگم چھیڑ رہے تھے۔ اس کے اعضاء خون میں سنے ہوئے تھے اور عارضوں پر آنسوؤں کے نقوش، گنگا جمنا کے دیرینہ بہاؤ کی دہائی دے رہے تھے۔ پھولی ہوئی آنکھ اس بات کی علامت تھی کہ بار بار اس رستے سے آنسو بہے ہیں۔

عبدالکریم نے اپنی کانپتی ہوئی نحیف انگلیوں کو مغفرت کی نبض پر رکھا ..... اور ''انا للہ و انا الیہ راجعون'' کی آواز ابھر کر فضاء میں تحلیل ہوگئی۔

اس کی آنکھوں کی وہ چمک جو اسے گرم سفر رکھتی تھی اب بالکل معدوم ہوچکی تھی۔ امید کا وہ پودا جس کی پرورش و پرداخت کے سہارے وہ اب تک زندہ تھا اس کے اپنے ہی وطن کے سفاک کتوں نے اپنی ہوسناکی سے پائمال کر دیا تھا۔

تب ہی ''دادا جان، دادا جان!'' کہتا ہوا پڑوس کا ایک چھوٹا سا لڑکا جو اپنے دادا عبدالکریم سے بہت خوش رہتا تھا، ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کھینچتے ہوئے بولا۔

''ان بدمعاش پولیس والوں نے دادی جان کو اس کمرے میں بند کر دیا ہے، اس کی سِکّوی اوپر ہے نا، میرا ہاتھ نہیں پہنچتا، اور ہاں! وہ اپی جان کو کہہ رہے تھے۔'' اس بچے نے ان کی آواز اور لہجے کو نقل کرتے ہوئے کہا، ''تو غدار ہے، تو باغی ہے اسی لیے تیرے بھائی کے باغی ساتھیوں نے تجھے نہیں مارا تا کہ تو .... تو .... '' لڑکے نے معصومیت سے اور خود پر جھلاتے ہوئے کہا، ''ٹھیک سے یاد نہیں آتا، وہ .... وہ کہہ رہے تھے تجھے ان لوگوں نے اس لیے چھوڑ دیا ہے کہ تو ان کے بچے پیدا کرے گی اور کہہ رہے تھے .... وہ سب تیرے یار ہیں۔''

یہ سب سنتے ہی غم اور غصہ کی لہر نے عبدالکریم کے اندر شکست اور ریخت کا وہ طوفان بپا کردیا کہ اس کے شانت چہرے کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ آیا وہ جھیل کی سطح آب کی پرسکون خاموشی تھی یا کہ سمندری طوفان کا پیش خیمہ دم سکوت ....

اس کے ذہن کی بھٹیوں میں لاتعداد خیالات پک رہے تھے، اور ان گنت سوالات اٹھ رہے تھے۔

''کیا وہ غدّار ہے؟

کیا وہ ایک غدار بیٹے کا باپ ہے؟

کیا وہ مجاہد آزادی نہیں؟''

سوچتے سوچتے اس کا دماغ کھولنے لگا، ''کیا ساری عمر کی وفاداری کا صلہ یہی ہے؟ آخر اس میں اس کا قصور کیا ہے؟

ناکردہ گناہوں کی سزا اسے کیوں دی جارہی ہے؟''

اس نے اپنے برانگیختہ جذبات سے مغلوب ہوکر چاہا کہ بندوق اٹھالے اور گولیوں سے اندھادھند لاشوں کی ڈھیر لگا دے لیکن اس کے اندر سے یہ متین آواز آئی ''صرف بندوق کی گولی ہی ہر مسئلے کا حل نہیں ہوسکتی ... .. وہ جنگ اور تھی جو انگریزی سامراجیت کے خلاف لڑی گئی تھی۔ اب وہ گولی کس کے خلاف چلائے گا یہاں تو ہر کوئی اس کا ہم وطن، اس کا اپنا ہی بھائی ہے۔''

ماتمی آسمان پر قرص خورشید بجھ چکا تھااور ہر طرف ظلمت نے اپنا سر ابھار لیا تھا۔

۸

نئی روشنی کا سوانگ

دیکھتے ہی دیکھتے شیشے کا گھر بھیڑیوں، ریچھوں اور کتوں سے کھچا کھچ بھر گیا ——— اب تو ایسا ہوتا کہ جس طرف نگاہ پڑتی۔ بھیڑیے ہی بھیڑیے اور ریچھ ہی ریچھ اور کتے ہی کتے نظر آتے۔ صرف شیشے کا گھر ہی کیوں ——؟ اب تو پہاڑ جنگل گاؤں میں بھی اس نحوست کے گھناؤنے اور غضب ناک پرندے نے اپنا پنکھ پھیلانا شروع کر دیا تھا۔

پہلے پہلے تو لوگوں نے سوچا اگر اکا دکا آدمی بھیڑیا یا ریچھ یا کتا بن بھی جاتے ہیں تو کوئی خاص بات نہیں ہے کیوں کہ جب سیکس تبدیل ہو سکتا ہے تو یہ بھی ممکن ہے لیکن ——— دن بہ دن جب اس میں اضافہ ہی ہوتا گیا تو یہ سڑکوں پر، بازاروں میں، چوراہوں پر خطرے کی علامت بن کر بالجبر لوگوں کی توجہ خاص طلب کرنے لگا۔ بالآخر یہ سوال اونچی اونچی کوٹھیوں پر شب خون مارنے لگا تو علماء کے لیے وبال جان بن گیا۔

پانی سر سے اوپر ہوتا دیکھ کر بلائے ناگہانی کے عنوان کے تحت لگے فلسفہ داں،

ماہرین نفسیات اور قانون ساز سر جوڑ کر بیٹھے۔ پہروں کی ماتھا پچی اور ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد بھی نتیجہ کی سلیٹ پر خارج قسمت کچھ نہیں آیا تو ہاتھ پر ہاتھ دے کر بیٹھ گئے۔

.....اور شیشے کے گھر میں بھیڑیوں، ریچھوں اور کتوں کے اضافے کی رفتار روز افزوں زور پکڑتی چلی گئی۔

بہت پہلے جب یہ وبا عام نہیں ہوئی تھی ایسا تھا کہ جو آدمی ریچھ یا بھیڑیا یا کتا ہوجاتا اونچی فصیل کے عقب میں یا بڑی دیوار کے اس پار چلا جاتا لیکن ——— اب تو حالت کی سور نے کروٹ بدل لی تھی کہ اس کے غلاظت سے اٹے پستانوں میں دودھ اتر آیا تھا اور فضا کثیف اور ماحول مکدر ہو چکا تھا۔ نتیجتاً بازاروں میں، چوراہوں پر، میلوں میں، پگڈنڈیوں پر ان کا ایک تھوہڑ تھا جو اگتا ہی چلا جا رہا تھا۔

بڑی حیرت تو ان کو تھی جن کے عزیز رشتہ دار اور احباب دیکھتے ہی دیکھتے بھیڑیے، ریچھ اور کتے ہوگئے ——— اب تو ایسا تھا کہ آدمی راہ چلتے آنکھ جھپکتے ریچھ بن جاتے، بھیڑیا ہوجاتے، کتے بن جاتے، وثوق کے ساتھ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ کس وقت کون اچھا بھلا مانس درندہ بن جائے۔ لوگ ایک دوسرے کو شبہ کی عینک لگا کر دیکھنے لگے۔ کان مردہ ہوگئے اور آوازیں اپنی اصلیت کھونے لگیں۔ ایک خوف کا دائرہ تھا جو لوگوں پر پھیلتا چلا گیا ——— مارے ہراس کے ہر کوئی اپنی اپنی خول میں سمٹنے لگا۔ دن بہ دن سب اپنی اپنی سرگرمیوں کو محیط کرتے چلے گئے۔ سہمے سہمے بدن کو ڈھونا ان کا مقدر ہو کر رہ گیا۔

کھانے کی میز پر، بس کی سیٹ پر، اسٹینڈ کی قطار میں، تنگ فٹ پاتھ پر یہ سوال سائے کی طرح لوگوں کا تعاقب کر رہا تھا۔ کھانے کی میز پر بیٹھا کوئی کتا نمودار ہوتا اور تمام ڈشیں اپنی جانب کھینچنے لگتا۔ اسٹینڈ کی قطار میں کھڑا شخص دیکھتے ہی دیکھتے اپنے پوشاک کے اندر سے ریچھ بن کر باہر آجاتا۔ تنگ فٹ پاتھ پر چلتا ہوا آدمی کس

وقت بھیڑیا بن کر بغل والے پر ٹوٹ پڑے یہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا ــــــ غرض یہ کہ نفسی نفسی کا عالم تھا۔ آدمی آدمی ایک عجیب اور انجانے خوف و ہراس کے حصار میں محصور انگلیوں پر اپنے پس ماندہ ایام حیات کو شمار کرنے میں غلطاں و پیچاں رہنے لگا۔

ایسے میں ایک دن وہ ہانپتا ہوا آیا اور ہانپتے ہانپتے کہنے لگا۔

''کہانی سنو گے؟''

''میں ایک کہانی میں الجھا ہوا ہوں۔''

''اس سے پہلے کہ تم بھی الجھ جاؤ یہ قصہ سنو۔''

میرے دوست ہم نے ایک ساتھ گلیاں دیکھیں، سڑکیں ناپیں، میدانوں کو گنا ہے، ہم ساتھ ساتھ درجوں پر چڑھے لیکن ــــــ ان ڈگروں سے گزرتے گزرتے ایک مقام ایسا بھی آیا کہ تیز آندھی نے ہمیں اپنی سمتوں کو بدلنے پر مجبور کردیا۔ اس موڑ سے ہوکر ہزار مزاحم پر بھی ہم چلتے ہی رہے..... چلتے ہی رہے۔

آج اچانک یہ کیسی وبا پھیل گئی ہے۔ اب تک تو محض کانوں نے ہی احساس کے در پر دستک دیے تھے لیکن ــــــ کچھ لمحہ پہلے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ مریض بھیڑیا بنا ڈاکٹر کو دبوچنے کی ناکام کوشش کررہا تھا اور وہ ڈاکٹر کسی سور کی طرح اس کے قدموں میں لوٹنے لگا تھا۔ یہ دیکھ کر دوسرے ڈاکٹرز بھی آپے سے باہر ہوگئے۔ اور کتے بن کر غرانے لگے۔ ریچھ بن کر دانت پیسنے لگے۔ دفعتاً ہوا کا رخ بدلا تو سب کے سب اس مریض پر ٹوٹ پڑے جو خود ہی بے چارہ ایک ماہر نفسیات کے زیر علاج اپنے بھیڑیا ہونے کو محض ایک وہم سے تعبیر کررہا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے..... وہ مریض ان کے درمیان نہیں رہا.....

اس وقت تک ہمارے تمام اسٹاف ریچھ کتے اور بھیڑیے ہوتے جارہے ہیں۔ مریضوں میں بھی یہ وبا تیزی سے سرایت کرتی جارہی ہے۔ ہمیں خوف ہے اگر ہم بھی وہی ہوگئے تو ان کا علاج کون کرے گا۔ ہم میں اور ان میں امتیاز کون

کرے گا۔

یہی المیہ تو میرے ساتھ بھی ہے میرے ہمنوا،

پچھلے اندھیرے میں جب میں گھر پہنچا تو کوئی نہیں تھا، آدمی کہیں جسے ———

رات آنسوؤں میں بہہ گئی۔

صبح میرے دھواں پانی کے شریک پر میری نگاہ پڑی تو دیکھتا کیا ہوں کہ وہ ادھر سے اُدھر جلدی جلدی اور مسلسل ٹہل رہے ہیں۔ یہ ایک اچھے فِلم پروڈیوسر ہیں اور عموماً زیادہ پریشان ہوجانے پر یوں ہی کیا کرتے ہیں۔ میں نے ان کے نزدیک جاکر یہی سوال اچھال دیا۔ پہلے تو وہ چونکے پھر عجیب معنی خیز نگاہوں سے مجھے گھورتے رہنے کے بعد بڑی سرگوشی کے انداز میں بولے، ''آؤ، اندر آجاؤ'' مجھے اندر لے جانے کے بعد تمام کھڑکی دروازے بند کردیے۔ اس کے بعد میرے دوبارہ سوال دہرانے پر ایک عجیب اشاروں میں انھوں نے جو کچھ کہا اس کا یہ حاصل تھا کہ بہت قبل انھوں نے اول اول اخباروں میں پڑھا تھا کہ مغرب میں کہیں کہیں لوگ بھیڑیے اور ریچھ بن گئے۔ میں نے غالباً یہی کہا اور مشرق نے اپنی روایت کے مطابق مغرب کی ہر نئی چیز کی طرح اس کی بھی بڑے شوق سے تقلید کی ہوگی۔ وہ ایک پھیکی ہنسی ہنس کر چپ ہوگئے۔

پھر انھوں نے کالے پتھر پر چاک سے لکھا، ''آج دنیا کا کوئی خطہ اس بلا سے پاک نہیں۔'' اس کے بعد انھوں نے کالے پتھر پر نقش شدہ تحریر کے اوپر مختلف زاویوں سے تھوکا اور پھر پہلے اپنی شہادت کی انگلی سے اور پھر اس کے بعد ہتھیلی سے اسے مٹانے کی ناکام کوشش کرتے رہے ..... میں نے عین اسی وقت ان کا چہرہ پڑھنا چاہا لیکن ..... ان کا چہرہ کسی بھی طرح کے نقش سے عاری اور قطعی سپاٹ تھا۔ میں نے اپنے ہونٹ سی لیے وہ مجھے بیٹھے گھورتے رہے پھر ..... یکایک اٹھ کر باہر چلے گئے۔ جاتے وقت مجھے پشت سے لگا جیسے اس طرف سے کوئی ریچھ گزرا ہو ابھی .....

میرا سر چکرا گیا۔

... .. اور شیشے کے گھر میں بھیڑیوں، ریچھوں اور کتوں کے اضافے کی رفتار روز افزوں زور پکڑتی چلی گئی۔

ایک شب وہ آنکھ کھول کر گھر سے نکلا تو دیکھا کہ پرچھائی میں تین چار عدد ریچھوں نے ایک بڈھے کو ننگا کر کے اس کی پیلی انگوٹھی پہن لی سنہری زنجیر کھینچ لی اور عقب میں اپنے سفید دانت گاڑ دیے اور اس پر تھوک دیا اور وہ کراہتا رہا۔

کان میں سے جوں ہی روئی نکالی ایک دل دوز چیخ اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

وہ چیخ رہی تھی چند بھیڑیوں نے زبردستی اس کے سامنے دانت سے کاٹ کر روٹی پھینک دی تھی وہ بھوک کی شدت میں بھی کھانے سے منھ موڑ رہی تھی .....

اس نے زبان پر صدیوں سے لگے زنگ آلود قفل کو کھولا تو ایک سرے سے گیٹ پر بندھے خارش زدہ کتوں نے بھونکنا شروع کر دیا۔

اب اس کے نزدیک کچھ کرنے کی باری تھی۔

میں نے دیکھا اس نے سب سے پہلے دیوار پر برسوں سے ٹنگے گرد سے اٹے نقاب کو اٹھا کر پہن لیا۔ پھر پٹاخوں کو جیب میں رکھ کر باہر نکل گیا۔ یوں کچھ دن اس کا معمول رہا... .. اخباروں نے لکھا یقیناً وہ دو ہاتھ آسمان سے آتے ہیں انھیں لٹکتے ہوئے کوئی نہیں دیکھتا اور .....

زمین کی پستانیں اور ناف بھیڑیوں، ریچھوں اور کتوں کے ناپاک لہوؤں سے خون آلود ہو جاتی ہیں۔ خس کم جہاں پاک!

لیکن جلد ہی پتھر سے ٹھیس لگی اور اس کا نقاب الٹ گیا۔ اس کے گرد خاکی پوش بھیڑیوں کا اژدہام تھا لمحہ بھر کو اس کا جی چاہا وہ نقاب پوش بن جائے ____ مگر اس وقت تک آہنی زنجیروں نے اس کے ہاتھوں کو باندھ دیا تھا۔

دفعتاً اس کے کانوں نے سنا کوئی کہہ رہا تھا شیر کو آزاد چھوڑنا خطرے سے خالی

نہیں اور آنکھوں نے دیکھا شیشے میں کوئی شیر بندھا کھڑا تھا۔

پھر ـــــــ کچھ ایسا ہوا کہ ہر ہفتہ عشرہ کوئی نہ کوئی شیر پکڑا جاتا اور زنداں کی نظر ہو جاتا۔ رفتہ رفتہ شیر زندانوں کو آباد کرتے رہے اور بستیوں میں ویرانیاں آباد ہونے لگیں۔ جا بجا چمگادڑوں کا ڈیرہ نظر آنے لگا۔ راتوں رات شہر کے شہر، شہر خموشاں میں تبدیل کر دیے گئے، کسی کو پتہ نہیں چلا یہ سب کیسے اور کیونکر ہو گیا۔

... .. اور شیشے کے گھر میں بھیڑیوں، ریچھوں اور کتوں کے اضافے کی رفتار روز افزوں زور پکڑتی چلی گئی۔

خوف نے لوگوں پر رعشہ طاری کر دیا تھا۔

شب کو سوتے وقت لوگوں نے کچھ ایسا معمول بنا رکھا تھا کہ جب آدھی رات ادھر اور آدھی رات اُدھر ہوتی، آنکھیں لگنے کا نام نہ لیتیں اور بستر تمام شکن آلود ہو جاتے تو وہ ایک دم بستر چھوڑ کر اٹھ جاتے اور اونچی اونچی پہاڑیوں پر چٹانوں کو اپنا عارضی مسکن بنا لیتے اور پہروں بیٹھے اپنی کھلی آنکھوں کو آسمان میں گاڑ دیتے کہ اس راستہ سے کوئی نجات دہندہ آئے گا، کوئی مسیحا جو اس دھرتی کے سینہ پر اترے گا اور ـــــــ یا کوئی والی نمودار ہوگا جو ہمیں قبر کی خاموشی سے بچا لے گا اور دم گھٹتے ماحول سے آزاد کر دے گا۔ ہمارے گرد پھیلے ہوئے ہراس کے کوڑھ سے شفایابی بخش دے گا۔ پھر وہ آسمان کی طرف دیکھ کر بدبداتے یکا یک ـــــــ اپنی اپنی گردنیں نیچی کر دیتے۔ پھر نہ جانے کن کیفیتوں کی زد میں آ کر اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ماحول کا جائزہ لیتے، ان کے ہونٹ خشک ہو جاتے۔ وہ دوبارہ خلا میں گھورنے لگتے ـــــــ دھیرے دھیرے مایوسی ان کے دلوں میں گھر کرنے لگی اور ناامیدی ان کے دماغوں میں قدم جمانے لگی۔

ہر آدمی محسوس کرتا ایک تاریک اور اندھا کنواں ہے جس میں وہ ہر وقت مسلسل اتارا جا رہا ہے اور یہ خیال جتنی شدت سے ان کے مغز میں کوندتا وہ اتنی ہی شدت سے

اونچی پہاڑیوں اور چٹانوں کی طرف دیوانہ وار بھاگتے اور سنکی گھوڑے کی طرح سرپٹ بھاگتے ——— دور بھاگتے ..... شہر خموشاں کی سی خاموشی اور ویرانیوں کا سا اکیلا پن انھیں اپنے احاطے میں لیے کھڑا تھا۔ وہ سراپا بگوش بنے جہاں جس حال میں تھے وہیں ساکن کھڑے تھے۔ انھیں تو غیب کی کسی غیر معمولی امداد کی ضرورت تھی۔ انھیں شاید یقین ہو چلا تھا کہ

الہام ان کے کام کا نہیں .....

وحی سے اب انھیں کچھ ہونے کا نہیں .....

انھیں اب کوئی کشتی ساحل سے لگا نہیں سکتی .....

انھیں اب کوئی بزرگ بچا نہیں سکتا .....

وہ پہاڑیوں کی طرف کان دیے کھڑے ہیں۔ ان کے دونوں کان کھڑے ہیں۔ وہ کسی کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ وہ کسی آواز کو لبیک کہنے کو تیار ہیں۔ کوئی انوکھی آواز ..... کوئی صور ..... شاید صور اسرافیل ..... صور اسرافیل ہی سہی ..... ہاں صور اسرافیل ہی۔

۹

جولان گاہ کی حد

ادھر کچھ دنوں سے میں شام کو جلدی گھر لوٹنے لگا ہوں۔
جگنوؤں سے بھرے کنکریٹ کے جنگل سے گزرتے ہوئے اب مجھے ڈر سا لگنے لگا ہے، جانے کیا بات ہے؟ اس آہنی شہر کی روشن سڑکوں پر چلتے ہوئے بار بار سہم جاتا ہوں، مجھے لگتا ہے کوئی تیزی سے میرے پیچھے لپکتا چلا آرہا ہے جو کچھ ہی دم میں پیچھے سے میرا کالر پکڑ کے روک لے گا۔ مجھے تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف بڑھنے سے روک دے گا۔ لیکن مجھے تو تیز تیز قدموں سے چلنے کی پرانی عادت ہے۔ جب میں پہاڑ جنگل گاؤں میں تھا، اس وقت بھی میں تیز تیز قدموں سے چلتا تھا، لیکن ادھر کچھ دنوں سے میں خوف زدہ سا رہنے لگا ہوں، گویا اس جگنوؤں سے بھرے کنکریٹ کے جنگل میں خوف گھات لگائے میرا انتظار کر رہا ہے اور میں جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا اس کے دائرہ کار سے دور نکل جانے کی کوشش میں دوڑتا ہوا گھر کی طرف آتا ہوں۔ دفعتاً پل کے اوپر سے چیختی، چنگھاڑتی، شور مچاتی ریل گاڑی تیزی سے گزر جاتی ہے۔ میں دم بھر کو بڑی حسرت سے اسے دیکھتا رہ جاتا ہوں، سوچتا

ہوں مجھ میں اور ریل گاڑی میں کتنی مسابقت ہے۔ میں پہاڑ جنگل گاؤں میں تھا جب بھی یہ اتنی ہی تیزی سے گزرتی تھی بلکہ ان دنوں زیادہ تیز رفتار تھی۔ مجھے یاد آتا ہے۔ میں اسی ریل گاڑی کی سیٹی سن کر بستر چھوڑتا تھا۔ فرسٹ ٹرین چار بجے بھور میں آتی تھی۔ مجھے لگتا گاؤں والوں کو جگانے آتی تھی یہ، اور اس کی سیٹی کی آواز کے ساتھ ہی سارا گاؤں جاگ اٹھتا تھا۔ پھر سیکنڈ ٹرین اور پھر دو بجے دن میں تھرڈ ٹرین آتی تھی۔ خواہ گرمی ہو سردی ہو یا برسات، مجھ میں اور ریل گاڑی میں کس قدر مسابقت تھی، تپتی ہوئی دھوپ ہو، کڑاکے کی سردی ہو یا موسلا دھار بارش، میں اپنے کاندھے پہ کدال اور ہل بیل لے کر کھیت پر کام کرنے نکل جاتا تھا، میں اس وقت بھی تیز تیز قدموں سے چلتا تھا، تیز تیز قدموں سے چلنا میں نے اپنے باپ سے سیکھا ہے اور میرے باپ نے شاید اپنے باپ سے سیکھا ہوگا۔

میری اس تیز رفتاری پر سب سے پہلے جو چیز مانع ہوئی، بجلی کی سپلائی تھی۔

ہمارے کھیت جب کئی دنوں تک مسلسل سوکھے پڑے رہ گئے اور لہلہاتی ہوئی فصل ہماری آنکھوں کے سامنے جھلس گئی تو میرے برسہا برس سے پہاڑ جنگل گاؤں میں جمے ہوئے قدم اک دم اکھڑ گئے۔ میرے باپ نے مجھے ریل گاڑی پر بٹھا کر آخری بار تلقین کی تھی ''بیٹا! اپنے تیز تیز قدموں کو آخری منزل تک کبھی رکنے مت دینا۔''

لیکن ادھر کچھ دنوں سے مجھے لگتا، کوئی تیزی سے میرے پیچھے لپکتا چلا آرہا ہے جو کچھ ہی دم میں پیچھے سے میرا کالر پکڑ کر روک لے گا، کارخانے سے نکل کر میں پل کے نیچے سے گزر کر ریلوے کراسنگ کے پاس جیسے ہی آتا ہوں، کوئی ان دیکھے ہاتھ کی پوریں میری گردن سے مس کر جاتی ہیں لیکن میں بغیر رکے وہاں سے بڑھنے لگتا ہوں، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ کوئی سربریدہ شخص ہے جو تعاقب کرتا ہے لیکن اس ریلوے پھاٹک کو نہیں لانگ پاتا ہے، شاید اس کی یہی حد ہے اور میں آنا فانا اس حد

سے اپنی پوری قوت سمیٹ کر تیزی سے گزر جاتا ہوں۔

مجھے لگتا کوئی ضرور ہے جو میری خواہشات کی ریکارڈ سن لیتا ہے اور میرے سپنوں کی فلم چھپ کے دیکھ لیتا ہے ..... جس سے اس کے سینے پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔ لیکن میں سوچتا ہوں، اس میں میری کیا خطا ہے خواب دیکھنا کوئی گناہ تو نہیں ..... ہوتا خواہشات پر کسی کا اختیار نہیں؟

یوں، میں دن پر دن کارخانے سے چھٹ کر پل کے نیچے سے گزرتا رہا اور ریل گاڑی چیختی چنگھاڑتی شور مچاتی پل کے اوپر سے گزرتی رہی .....

پچھلے کئی دنوں سے کارخانے میں بھی عجیب عجیب سی بات سننے میں آرہی ہیں۔ پتا نہیں کب کیا ہو جائے، جگہ جگہ لکھ کر ٹانگا جارہا ہے، ''آپ کی بیوی اور بچے گھر پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں، ہوشیاری سے کام کریں، آپ کی زندگی قیمتی ہے، گھر سے باہر نکلنے اور گھر میں داخل ہونے تک کی زندگی کے لیے ہم دعا کرتے ہیں۔ آپ بحفاظت لوٹیں۔ بوٹ، ہیلمیٹ اور دستانوں کے بغیر کارخانے میں داخل نہ ہوں، سیفٹی بیلٹ ضرور استعمال کریں'' وغیرہ وغیرہ۔ نئے نئے پلانٹ قائم کیے جارہے ہیں۔ ایک کمرے میں بیٹھ کر خدا جانے کیوں کر پوری یونٹ کی دیکھ ریکھ ہو جاتی ہے۔ مجھے تو ان ننھے ننھے سے آسیبی جگنوؤں سے بہت ڈر لگنے لگا ہے کیوں کہ جب سے یہ آئے ہیں کئی ہزار مزدور تعطل کے شکار ہو گئے ہیں۔ بڑی مشینوں کے متعلق سنا تھا کہ ان کے ذریعہ کم وقت میں بڑے پیمانے پر پیداوار کی جاسکتی ہے۔ لیکن ان ننھے ننھے جگنوؤں اور شیشے پر اترنے والی تصویروں نے تو بڑی تعداد میں مزدوروں کو کام پر سے ہٹا دیا ہے۔ میرے کئی ایک ساتھی بیٹھا دیے گئے ہیں۔ کچھ کو تو عارضی ملازمت پر ہی کمپنی خود اختیاری ریٹائرمنٹ کے لیے مجبور کر رہی ہے لیکن اگر ایسا واقعی ہو گیا تو مجھ جیسے مزدور کا حشر کیا ہوگا؟ جو اپنے کھیت کو بجلی کی قلت کے سبب چھوڑ چکا ہے۔ جس کے گھر پر جوان بہنیں ہر ماہ دس تاریخ کو منی آرڈر کا انتظار کرتی ہیں۔ جس کا

بوڑھا باپ اب تیز تیز قدموں سے چل نہیں سکتا ہے جس کی ماں کو بلڈ پریشر کی دوا بغیر ناغہ روز کھانا ضروری ہے جس کا بھائی اسکول کی فیس کے لیے پوسٹ آفس میں آ کر بار بار دریافت کرتا ہے، شہر سے کوئی خط آیا؟ جس کی بیوی کے کپڑے پھٹ گئے ہیں جس کے بچے کے لیے دودھ پاؤڈر ہر ماہ خریدنا پڑتا ہے جسے مکان کا ایک سو روپے کرایہ دینا پڑتا ہے۔

میں اسی ادھیڑ بن میں الجھا ہوا آگے بڑھ رہا ہوں کہ مجھے کسی نے پیچھے سے آوازی دی۔ مڑ کے دیکھا تو رامو کھینی والا ہے، بے چارہ کس قدر غریب ہے یہ، یہ ہمارے ہی ٹھیکیدار کے پاس ملازم تھا، بہت ایمانداری اور محنت سے کام کرتا تھا لیکن اس کی ایمانداری کا صلہ کیا ملا، دونوں ٹانگیں کٹ گئیں اور ٹھیکیدار نے اب تک اس کا پورا معاوضہ تک نہیں دیا۔ آخر ہم مزدوروں سے دیکھا نہ گیا تو سبھوں نے مل کر اسے ایک کھینی کی دکان کرادی۔ اب اسی پیپل کے نیچے بیٹھ کر کھینی بیچتا ہے۔ دو بچے اور بیوی کا خرچ کسی طرح نکل ہی جاتا ہے۔

ارے بھیا! کچھ سنا تم نے؟

کیوں کیا بات ہے پھر کوئی درگھٹنا ہوگئی کیا؟

سنا ہے کہ کارخانے میں سائنٹفک مینجمنٹ لاگو ہونے والا ہے۔ اس سے ہم مزدوروں کا بڑا نقصان ہوگا۔

نہیں رامو، ایسی بات نہیں، اس سے ملک کی مجموعی پیداوار میں اضافہ ہوگا۔

لیکن ان مزدوروں کا کیا ہوگا جو بڑی تعداد میں بیٹھا دیے جا رہے ہیں، اس سے بے روزگاری نہیں بڑھے گی؟

یہ مسئلہ اور ہے ہمیں جذباتی نہیں ہونا چاہیے۔

لیکن اس مسئلہ کا حل ....؟

ہاں! اس مسئلے کا حل .... اس کے لیے حکومت کو غور کرنا چاہیے۔

دفعتاً فضا میں سائرن کی آواز گونج اٹھی اور میں وہاں سے کھینی اور چونا لے کر تارکول کی چمکیلی سڑک پر اپنی بوٹ چرمراتا ہوا اپنے سائٹ پر پہنچ گیا ہوں، کارخانہ کیا ہے بڑی بڑی آہنی مشینوں کا ڈھیر لگا ہے۔ بڑی بڑی خوبصورت پلانٹ کھڑی ہیں، دور دور تک اکا دکا مزدور کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔ دھڑام دھڑام کی تیز آواز کے ساتھ کام ہو رہا ہے لیکن مزدور بہت کم نظر آتے ہیں۔ دن بہ دن ماحول آسیب زدہ ہوتا جا رہا ہے۔ لگتا ہے کوئی بھوت بنگلہ ہے جہاں ان دیکھے قوی ہیکل ہاتھ بڑے اور بھاری کام انجام دے رہے ہیں۔ ایسے میں ایک لمحہ کی بھی غفلت موت کا پیغام بن سکتی ہے۔ واقعی زندگی بڑی پیچیدہ ہوگئی ہے۔ میں نے سوچا۔

رات کو جب میں اوور ٹائم کر کے چھٹا تو رامو اپنی دکان اٹھا کر جا چکا تھا۔ موہن اور کلام اپنے ہیلمیٹ ہاتھ میں لیے چلے آرہے تھے۔ میں ان کی ہمراہ باتیں کرتا ہوا پرانے چوک تک آیا پھر وہ دونوں دوسری طرف چل دیے۔ میں جوں ہی پل کے نیچے سے ہو کر گزرا ریل گاڑی چیختی چنگھاڑتی شور مچاتی تیزی سے گزر گئی۔ اسی وقت میری نگاہ سر بریدہ شخص سے جا ٹکرائی۔ اس کے سینے پر کئی ایک برچھیاں پیوستہ تھیں، زخموں سے خون رس کر ننھے ننھے بالوں میں لت پت ہو رہا تھا۔ تمام اعضا کالک اور میل سے چپ چپ ہو رہے تھے۔ اس نے دونوں پاؤں میں بھاری بھرکم بوٹ پہن رکھے تھے، لمحہ بھر کو رکا لیکن معاً مجھے یاد آیا۔ مجھے اپنے بچے کے لیے دوا خریدنی ہے۔ میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

بے چاری میری بیوی نے صبح گھر سے نکلتے وقت کس قدر افسردگی سے کہا تھا اپنا بابو بیمار ہے۔ کل بھی میں نے یہ بات ظاہر ہونے نہیں دی تھی لیکن اب بخار اترنے پر نہیں آرہا ہے اور اب دوا ضروری ہوگئی ہے۔ اف! اس نے کیسے اپنی ممتا کو سمجھایا ہوگا۔ اس کے پھول جیسے کمہلائے چہرے کو اپنے سینے سے لگائے وہ خود بھی کتنی دبلی ہوگئی ہے۔ مجھے یاد ہے شادی کی وہ رات جب پہلے پہل اس نے اس گھر

میں قدم رکھا تھا۔ کیسا تمتمایا ہوا تھا وہ چاند سا دمکتا چہرہ۔

صبح میری بیوی نے ناشتے کے لیے آٹے کی ٹن سے آٹا کچھ اس طرح سے جھاڑ کے نکالا کہ ٹن کے خالی ہونے کی آواز صاف سنائی دے گئی۔ آہ! کتنی عقلمند ہے وہ! آٹا کے لیے کہہ کر وہ شاید مجھے شرمندہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ابھی تنخواہ ملنے میں پورے پانچ دن باقی ہیں۔

کارخانے سے سہما سہما، خوف زدہ سا لوٹ رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے آکر آہستہ سے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں جانتا تھا یہ وہی ہے میں چپ چاپ چلتا رہا اور بغیر اس سے آنکھ ملائے اس کے سوالوں کا جواب دیتا رہا۔

تمھاری دونوں بہنیں جوان ہو چکی ہیں؟

ہاں! میں ان دونوں کی شادی ایک ساتھ کر دوں گا۔

لیکن آخر کب؟

مستقبل سے زیادہ حال کی ضرورت شدید ہوتی ہے۔ اگر وہ زندہ رہیں گی تو شادی بھی ہو جائے گی۔ پہلے انھیں زندہ باقی رکھنا زیادہ ضروری ہے۔

یاد ہے تم نے اپنی ماں سے کیا وعدہ کیا تھا؟

لیکن بابو کی بیماری کا علاج بھی تو ضروری تھا۔

تم جانتے ہو مہنگائی آسمان سے باتیں کر رہی ہے اور پھر بھی وہی ....؟

کیا کروں اوور ٹائم نہیں ملتا ..... اسی لیے تو شہر سے دور گندگی میں رہتا ہوں کہ یہاں مکان کا کرایہ صرف ایک سو روپیہ ہے، ورنہ ....

دفعتاً موہن اور کلام نے آکر سلام کہا اور ہم تینوں چلنے لگے۔ کارخانے میں مختلف پلانٹ کا قیام مکمل ہوتا جا رہا ہے اور ٹھیکیداروں کی ٹھیکیداری ختم ہوتی جا رہی ہے۔ بہت سے پڑھے لکھے مزدور ٹیچر ٹریننگ اور کمپیوٹر آپریٹنگ سیکھ کر خود ہی مزدوری چھوڑ دے رہے ہیں، لیکن ہمارے جیسے مزدور اگر ایک دن بھی بیٹھ جاتے ہیں تو پورا کنبہ

متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اسی وقت وہ سر بریدہ شخص میرے تصور میں ابھرا۔

آخر اس طرح کتنے دنوں تک کام چل سکتا ہے، کام اگر ختم ہوگیا تو کیا کروگے؟

میں پہاڑ جنگل گاؤں چلا جاؤں گا۔

لیکن تمھاری بہنوں کی شادی، ماں کی دوا، بھائی کی فیس، بیوی کے کپڑے، بچے کا دودھ .....؟

سوال ..... سوال ..... سوال .....

میں نے دیکھا اس کے سینے کے زخموں سے بہنے والی خون کی دھار تیز ہوگئی ہے۔ ناف سے ہوتی ہوئی خون کی لکیر ایڑی تک پہنچ گئی ہے۔ زخموں سے میل اور کالک مل کر ننھے ننھے بالوں میں لت پت ہوتے جا رہے ہیں۔

پھر شام ہوگئی .....

پل کے نیچے سے ہو کر گزرتے ہوئے میں دیکھتا ہوں۔ پل کے اوپر سے ریل گاڑی چیختی چنگھارتی شور مچاتی تیزی سے گزر رہی ہے۔ میں تیز تیز قدموں سے اپنے گھر کی طرف بڑھ رہا ہوں۔

میں نے موہن اور کلام کو چائے کی پیالی بڑھاتے ہوئے سر بریدہ شخص کا تعارف کرایا لیکن پہلے تو وہ چائے کے درمیان اس شخص کی کہانی سنتے رہے پھر جلد ہی چائے ختم ہونے کے ساتھ وہاں سے غائب ہوگئے۔ مبادا انھیں کچھ ایثار نہ کرنا پڑ جائے۔

☆☆☆

آج نئی پلانٹ کا کام مکمل ہو چکا ہے۔ ٹھیکیدار نے مٹھائی بٹوائی ہے۔ ان کا نیا کام وشاکھاپٹنم میں شروع ہونے والا ہے۔ بہت سے مزدور ان کے ساتھ جا رہے ہیں لیکن میں سوچ رہا ہوں وشاکھاپٹنم جانے کا کرایہ، مکان کا کرایہ، پھر وہاں جا کر مکان کا ایڈوانس، راشن، بابو کے لیے دودھ کا ڈبہ، ان ہی میں تو ساری تنخواہ صرف

ہوجائے گی، پھر بھائی کی فیس، ماں کی دوا اور بیوی کے کپڑے کے پیسے کہاں سے آئیں گے؟

موہن اور کلام بھی وشاکھاپٹنم جارہے ہیں۔ وہ مجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا میں بھی وشاکھاپٹنم جانے کی تیاری کر رہا ہوں، لیکن میں سوچتا ہوں۔ انھیں کیا جواب دوں؟

میرے پاؤں جس زنجیر سے بندھے ہیں، اس کی ڈھیل اتنی نہیں کہ میں وشاکھاپٹنم تک جاسکوں۔ جگنوؤں سے بھرے اس کنکریٹ کے جنگل تک کی ہی زقند میری جولاں گاہ کی حد ہے۔ میری بساط میں اس سے زیادہ وسعت کہاں؟؟

کارخانے کا سائرن بج چکا ہے... .. آج اوور ٹائم نہیں کرنا ہے۔ کل سے کارخانے نہیں جانا ہے.....

یہ سب سوچتے سوچتے دل بجھا جارہا ہے۔

دفعتاً میرے ذہن میں سربریدہ شخص ابھرتا ہے۔ خون میں لت پت سینہ، بوٹ کی کھڑکھڑاہٹ، میلا کچیلا جسم، وہ آکر مجھ سے پوچھتا ہے۔

کیا تمھاری بیوی یہ سب سن کر برداشت کرسکے گی؟

شاید ..... نہیں یا شاید ..... ہاں بھی!

تمھاری ماں؟

شاید!

کیا اکھڑے ہوئے قدم دوبارہ جم سکتے ہیں؟

گارنٹی تو زندگی کی بھی نہیں۔

کوئی اس طرح کب تک اکھڑتا رہے گا؟ تمھیں معلوم ہے تم کدھر جارہے ہو؟ تم کہاں ہو؟

سوال در سوال ..... ایک وقت میں ایک سوال ہو تو جواب بھی دیا جاسکے،

یہ لامتناہی سوالات، دائرہ اندر دائرہ سوال .... یہ تو پوری دنیا کو اپنی زد میں لے سکتے ہیں۔

میں اس سربریدہ شخص کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ ذرا سوچو، ہمارے ان مزدور ساتھیوں کا کیا ہوگا جس کی ماں سرکاری اسپتال میں کینسر کے روگ میں پڑی ہے اور جن کے پاس تھرموتھیراپی کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ اس کا کیا ہوگا؟ جس کا باپ ذیابیطس کے مرض میں مبتلا ہے، اور جس کے پاس انسولین کے انجکشن کے لیے پیسے نہیں ہیں، اس کا کیا ہوگا جس کے والدین نیم فالج زدہ بستر پر پڑے روٹی کے انتظار میں اپنے بیٹوں کی راہ دیکھتے رہتے ہیں۔

مجھے ان سوالوں کو دہراتے ہوئے بے چینی اور قدرے متلی معلوم ہونے لگی ہے۔ میرا دل بیٹھتا جا رہا ہے.....

میں خوف زدہ ہوں۔ تیز تیز قدموں سے چل کر جلد ہی گھر پہنچ جانا چاہتا ہوں، لیکن آج میرے پاؤں نہ جانے کیوں پھنس پھنس جا رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کوئی تیزی سے میرے پیچھے لپکتا چلا آ رہا ہے جو کچھ ہی دم میں پیچھے سے میرا کالر پکڑ کے روک لے گا۔ جوں ہی پل کے قریب پہنچا تو دیکھتا کیا ہوں کہ پل کے گرد بڑی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ شام والی چیختی چنگھاڑتی شور مچاتی ہوئی تیزی سے بھاگنے والی ریل گاڑی آج اچانک اُلٹ پڑی ہے اور جس کے کئی ڈبوں کے پرخچے بکھر چکے ہیں۔ اسی وقت بھیڑ سے نکل کر کوئی شخص یہ فقرہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

"گاڑی اتنی تیز مت چلاؤ کہ سامنے اگر پتھر آ جائے تو بریک بھی نہ مار سکو۔"

اور یہ فقرہ میرے ذہن سے چپک کر رہ گیا.... کیا واقعی....؟

کرشن ___ کھوئے یگ کی جستجو

ماضی حقیقت ہے، حال سراب اور مستقبل مجاز اور افسانہ .....

نئے یگ کے کرشن! تمھیں یاد ہے؟

میرؔا اور سلمیٰ تمھیں ٹُھل ٹُھل کہا کرتی تھیں۔ تم ان کی ننھی ننھی گڑیوں جیسی شبیہ کے پیچھے بھاگتے بھاگتے رک جاتے تھے۔ تمھارے شریر کے سب سے کومل انگ پر شرمیلی کرن دوڑ جاتی تھی۔ تم ان سب سے الگ من میں درد کی مٹھاس لیے نیم کی ٹھنڈی چھاؤں میں کھڑے، بس دوُر سے وہ سب کچھ دیکھا کرتے تھے۔

میرؔا، سلمیٰ، بوچی کتنے نام .... لیکن تمھارا من تو بس میرؔا میرؔا پکارا کرتا تھا۔ اس اندر کی پکار میں اور کسی ابیا کی ڈالی پر بیٹھی کوئل کی کوہو کوہو، میں کتنی مشابہت تھی۔

ابیا اور ماجھر، خوشبو اور گرماہٹ، پھل اور رس سب گڈمڈ ہو کے رہ گئے تھے۔

پھر ایک دن کھیلتے کھیلتے، دور بہت دور نکل گئے تھے، تم۔ جہاں صبح اور شام، زمین اور آسمان شفق پر سمٹ آئے تھے۔ گرجا کے پرشکوہ سکوت میں جہاں نقرئی گھنٹیوں کی کھنکھناہٹ مقدس فضا میں رس گھول رہی تھی۔ جہاں پھولوں کی جھرمٹ میں میرؔی

اور پیٹر جیسے ہمجولیوں کے ساتھ کھیلتے چھپتے اچانک تمھاری نظر صلیب پر لٹکے ہوئے یسوع پر پڑ گئی تھی۔ یسوع کا معصوم باریش چہرہ کیسی کیسی انوکھی اور انجان اور حیرت انگیز داستانیں سنا رہا تھا، تمھیں۔ تم وہاں سکتہ کی حالت میں کب تک کھڑے رہے، کچھ پتہ بھی نہ چلا۔ وقت تھم چکا تھا، تم جب واپس آئے تو تمھاری ماں کے پھیلے ہوئے آنچل بھیگ چکے تھے۔ تمھاری بہنوں کی آنکھوں کے کاجل ڈھل چکے تھے، اور تمھارے بھائی تھک کر ہانپ رہے تھے۔

تم نے اپنی میٹھی مسکان سے سبھی مرجھائے کنول شاداب کر دیے تھے۔ تمھاری بانسری کی سریلی آواز سے، وہ گائیں جو منھ چلانا بھول گئی تھیں، پھر منھ چلانے لگیں۔ ان کی گردنوں میں پیتل کی جھولتی گھنٹیوں کی آواز سے ماحول میں ایک بار پھر زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

شاہین! ننھی سی پری، پریوں کی ملکہ، گول مول سی، سب کی پیاری لیکن اس کے پروقار بُراقوں جیسے پنکھ تو صرف تم ہی دیکھ سکتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے، جن کو دیکھنے سے بدن میں گدگدی سی دوڑ جاتی تھی، نرم، ملائم اور خوبصورت پر، لیکن موہن اس کی آنکھوں میں بھی جادو تھے۔

تم اس کی جادو اثر آنکھوں کو دیکھ کر دُنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو گئے تھے۔ پھر ایک تیز آندھی ایسی آئی کہ بڑے بڑے پیپل اور برگد کو بھی اس نے اپنی جڑیں چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اس سے پہلے کبھی ایسی آندھی نہیں آئی تھی۔

تم ہم سب سے بچھڑ گئے تھے۔ تمھیں کھوئے ہوئے یگ بیت گیا۔ لیکن تم نہیں آئے۔ تم جنگل جنگل، من میں دکھ کی گٹھری باندھے گھومتے رہے، آم کی نئی ٹہنیوں کے پیچھے، جامن کی لچیلی شاخوں کی اوٹ سے کوئی تمھیں پکارتا، اپنا من موہک چہرہ دکھلاتا اور چھب سے چھپ جاتا۔ تم اسے ڈھونڈتے رہے، خاردار جھاڑیوں سے الجھتے رہے، مگر وہ سنہری ہرن بن گیا۔ تمھاری بانسری کی آواز اس کا

تعاقب کرتی رہی، وہ بھاگتا چھپتا رہا حتیٰ کہ ایک دن اچانک ..... جب تم ٹھوکر کھا کر گرے تو ہوش آنے کے بعد تم نے دیکھا نغمہ اپنی صراحی سے تمھارے خشک پیاسے ہونٹوں کو شیتل جل سے بھگو رہی تھی۔

نغمہ ذہین تھی، عقل کی دیوی، علم و دانش کی ملکہ، اس کی آنکھوں سے لطیف روشن شعاعیں پھوٹتی تھیں۔ تم کو ایسا معلوم ہوا، وہ فراست کی دیوی ہے۔ تم نے اس کے مارگ پر خود کو ڈال دیا۔ تم اس کے اندر جگہ بنانے لگے، اس نے تمھاری انگلی پکڑ کر ماکھن کی ہانڈیوں تک تمھارا مارگ درشن کیا، ماکھن چکھتے ہی تمھارے اندر ایک نئی دنیا کا انکشاف ہو چکا تھا۔ ہر وقت خواب میں تمھیں ماکھن کی ہانڈیاں جھولتی نظر آتیں، تم ان چھپی ہوئی ہانڈیوں کو چور نظروں سے ٹٹولتے، ان ہانڈیوں میں محفوظ ماکھن کی خوشبوئیں تمھیں بے شرم بناتی جا رہی تھی۔

نغمہ چھوئی موئی تھی۔

تم اسے چھوتے ڈرتے تھے۔

لیکن تمھاری بانسری کی مدھر آواز ــــــ تمھاری لافانی طاقت سے ــــــ وہ کھل اٹھتی تھی۔ وہ کتنی حساس طبیعت تھی، تمھارے اشارے سے مرجھاتی اور آواز سے کھل اٹھتی تھی۔ اس کی زلفوں کی خوشبو تمھارے سوا بھی کسی نے سونگھی تھی، نہیں کسی نے نہیں، وہ تمھارے لیے تھی۔ کیا تم نے نہیں دیکھا تھا جب سوتے میں اچانک تمھاری آنکھ کھلی تو وہ تمھاری بانسری کو اپنے ہونٹوں سے لگائے اپنی امنگوں کو آواز دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ آج بھی اس بانسری میں ان ہونٹوں کے نشان ثبت ہیں۔ لیکن نغمہ، علم و فراست کی دیوی تمھاری مارگ درشن کرنے والی اچانک ان کہی، بے دل، انجان درختوں کی بھیڑ میں کھو گئی۔ ندی کے پار ساحل کے دھندلکوں میں گم ہو گئی، بیچ میں ندی گہری تھی اور ندی میں ان دنوں باڑھ آئی ہوئی تھی۔

وقت کا پاگل پنچھی، نراشا کے گھنگھریالے بالوں میں الجھ کے اڑنا بھول گیا....

اڑہل کے گہرے سرخ پھولوں جیسے ہونٹوں میں تم کو شردھا اور تقدس نظر آئے۔ کالی کٹیلی آنکھوں میں گیان کی گہرائی موجیں مار رہی تھی۔ ستارہ جیسی ٹمٹماتی ہوئی آنکھوں میں صدیوں کے چھپے ہوئے کچھ پیغام تمھارے لیے بیاکل تھے۔

اگر ورشا کی امید ہوتی ہے تو آشا کی ماری ہزاروں لاکھوں پیاسی سیپیاں سطح سمندر پر اپنے لب کھول دیتی ہیں۔ بظاہر شانت سمندر کالی گھٹاؤں کی آمد پر ہلوریں کھانے لگتا ہے لیکن اس کی بے کراں وسعت و گہرائی ان باتوں کو عیاں ہونے نہیں دیتی۔ کرشن تم کالی گھٹا تھے جس کی آمد پر نیلوفر کے اندر سمندر کی پیاس جاگ اٹھی تھی۔

لیکن کالی گھٹا پہ نغمہ کی خوشبوئیں بسی ہوئی تھیں۔ انجان ان دیکھی راہوں پر چلتے چلتے شال کے اونچے اونچے درختوں کی شاخوں پر چپکے سے پونّم نے دستک دی۔ یاد ہے تم نے گھوم کے دیکھا تو وہاں پرنماشی کا چاند.... لال چاند..... ضیاپاشی کر رہا تھا۔ پھر تم نے کنویں کے اندر جھٹ پٹے کے وقت پانی کی سطح پر اسی پرنماشی کے چاند کو جھانکتے ہوئے نہیں دیکھا تھا؟ یاد کرو، وہ پونّم ہی تھی جو کسی پھولوں کی پریوں کی طرح جب تم یوگ کرکے نکلتے تھے تمھارے شریر سے انگارے سے نکل رہے ہوتے تھے، اس وقت وہ نہر کے کنارے گلاب کی شبنم آلود نیم وا پنکھڑیوں کو اپنی مخروطی انگلیوں کے سبک لمس سے جگا رہی ہوتی تھی۔ کیا اس کی آنکھوں کے سرخ ڈوروں میں تم نے خود کو الجھتا ہوا نہیں محسوس کیا تھا؟

کرشن، وہ داستانوں میں ہی زندہ رہنے والی خیابانوں کی پری نہیں تھی، وہ جیتی جاگتی حقیقت تھی، دھیمی آنچ کی، چھوٹی بحر کی، سنوری سمٹی، مسلسل و مربوط غزل۔ اس کے دونوں شانوں پر پاک اور لطیف روپہلی کرنیں ہردم سایہ فگن رہتی تھیں۔

لیکن اس چاند کی ٹھنڈی روشنی میں تڑپ کی وہ مٹھاس نہیں تھی جو میّرا کے موہن کو باندھ سکتی اور ماکھن کی خوشبوؤں کی وہ گرمی نہیں تھی جو نغمہ کے کنہیا کی بانسری

میں سوز و گداز پیدا کر سکتی:

بادلوں کی گڑگڑاہٹ، بجلیوں کی کوند اور زلزلے، طوفان اور آندھیاں ...
انسان انسان ہوتا ہے — محبت کی جوت دل میں جلائے بڑھتا رہا
سمندر ریگستان پہاڑ میدان اور پھر جنگل کھیت گاؤں اور شہر
شہر جنگ و جدل، بغاوت انقلاب
بیداری اور انقلاب
کارخانہ مشین اور اونچی اونچی چمنیاں
اور پھر ریل گاڑی

کرشن تمھیں یاد ہے، چھک چھک کرتی دھوئیں اگلتی ریل کے سفر نے تمھیں ایک نئے جہاں کی سیر کرائی تھی۔ گول گول پیتل کے کلسوں والے مندر، مندر کے اندر ٹن ٹن بجتی گھنٹی، مندر کے اندر سلگتی دھوپ اور دھوپ کے دھوئیں سے اٹھتی پراسرار خوشبوئیں۔ گونجتی ہوئی اشتعال انگیز خاموشی جہاں سب کچھ سمرپن کرنے کو جی چاہے۔ دودھوں سے بھری بے سینگوں والی گائیں، دور تک جاتے ہوئے مندر کے گرد سرسوں کے کھیت، بیچوں بیچ بہتی ہوئی شیتل جل کی گہری نہر، کرشن یاد ہے تمھیں کھوئی ہوئی جنت پھر مل گئی تھی۔ تب بانسری پر تمھاری انگلیاں کتنی تیزی سے رینگتی تھیں۔ مندر میں کہیں نہ کہیں کوئی مقناطیس ضرور تھا جو تمھیں ہر دم اپنی اور کھینچتا رہتا تھا۔ ایک بار پھر تم کسی عبادت گاہ کے آکرشن میں کھو گئے تھے۔ تم پھر بھول گئے تھے کہ تمھاری ماں اب بھی آنچل پسارے تمھارا انتظار کر رہی ہے۔ تمھاری یاد میں تمھارے باپ کی آنکھوں کی روشنی چلی گئی ہے۔ تمھارے بھائی تمھیں جنگلوں میں ڈھونڈ رہے ہیں۔ تمھاری بہنیں بھائی دوج اور راکھی کی دہائیاں دے رہی ہیں۔ تم نئی دنیا کے سنہرے گپھاؤں میں اترتے رہے نکلتے رہے۔

کلیاں مرجھا گئیں۔ پھول سوکھ گئے، آنکھیں سوج گئیں ... .. دل ویران

ہو گئے.... آخر ماں کی شفقت نے اپنے آنچل میں بکھرتے ہوئے موتیوں کو سمیٹ لیا۔

کرشن سفر تو پھر بھی باقی رہا، جسے ادھورا چھوڑ کر تم بچھڑ گئے تھے، وہ ابھی طے کرنا تھا۔

زلزلے سے لوگ مرتے رہے، مکانات ڈھتے رہے
قحط اور خشک سالی سے کھیت سوکھ گئے، لوگ بھوک سے مر گئے
ندیوں میں سیلاب آیا کتنے باندھ ٹوٹ گئے
کھیت کھلیان گاؤں اور قصبے ڈوب گئے، لوگ ڈوب کر مر گئے
کبھی ہیضہ کبھی پلیگ کبھی چیچک
پھر بھی ہم آگے بڑھتے رہے....

دنیا سمٹتی گئی، سفر آسان ہوتا گیا لیکن انسان خود سے دور ہونے لگا۔ خلائی سفر نے چندر ما کو انسان کے تلوؤں کے نیچے لا کھڑا کیا۔

دنیا کس قدر تیز گام ہو گئی، کرشن! شہر میں انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ گوپیوں کے ہجوم میں کرشن تم خود کو تنہا محسوس کرنے لگے، کہیں چہرہ تھا تو کئی چہرے تھے نہیں تو سرے سے چہرہ مسخ ہو چکا تھا، گگن چمبی عمارتوں میں دم گھٹتا تھا۔ سڑکیں سرنگیں معلوم ہوتی تھیں۔ چوہوں کی طرح دوڑتے ہوئے انسان کس قدر بزدل ہو چکے تھے، انسان کی جان کی قیمت کتنی گر چکی تھی، ایک لمحہ کی بھول ہزاروں انسانوں کو پٹری سے الٹ کر کھائی میں گرا سکتی تھی، آنکھ جھپکتے میں اڑتا ہوا طیارہ سیکڑوں انسانوں کو دریا برد کر سکتا تھا، زلزلہ کا ایک ہلکا سا جھٹکا لاکھوں لوگوں کو پکی قبروں میں منتقل کر سکتا تھا۔ کرشن! تمھاری بانسری کی آواز اس نقار خانے میں کون سنتا اور کیوں کر سنتا؟ جہاں گولیوں کی آواز پر سرحدیں تقسیم ہوتی ہوں۔ جہاں برچھیوں اور تلواروں کی نوک پر دھرم، کی مذہب کی

تشکیل نو ہوتی ہو، جہاں عبادت گاہوں کو توڑ کر عورتوں کے ساتھ جشن فتح مندی منایا جاتا ہو۔

لڑائی، جنگ، فسادات!

جہاں لیلیٰ، جہاں شیریں، جہاں ہیر، جہاں جولیٹ، جہاں قلوپطرہ کی اجتماعی عصمت دری ہوتی ہو، جہاں سیتا، جہاں مریم کی پاک دامنی پر شک کیا جاتا ہو، کرشن! جہاں دروپدی کے تن کے کپڑے سر محفل کھینچے جاتے ہوں، وہاں تمھاری بانسری کی مدھر آواز پر کان کون دھرتا؟ یہاں ہر من میں واسنا پلتی ہے، یہاں ایک رات میں محبت جوان ہوتی ہے اور صبح ہونے سے پہلے دم توڑ دیتی ہے، جہاں جسم کا ملن ہوتا ہے روح تو پیاسی ہی رہ جاتی ہے۔ غرض کہ تم یاد کرو، کتنے اداس رہنے لگے تھے تم، تمھاری اداسی کتنی طویل تھی، کتنی نسلیں اداس رہیں، جانتے ہو تم؟

کرشن! اگر تم اسی طرح اداس رہے تو ساری دنیا اداس ہو کر فنا کے غار میں اتر جائے گی اک دن۔

آؤ کرشن! واپس چلو .....

اسی جگہ جہاں سے آئے تھے تم، جہاں آم کی لچیلی ڈالیوں پر کوئل کوکتی ہو، جہاں گھر گھر ماکھن رلتا ہو، جہاں نرمل جل کے جمنا تٹ پر تمھارے انتظار میں آج بھی گوپیاں بیٹھی ہوں، جہاں پنگھٹ پہ پازیب پہن کر آج بھی گوری آتی ہو، جہاں کمر کمر گاگر چھلکاتی آج بھی پنہاری جاتی ہو، جہاں ساون میں آموں پر سکھیاں آج بھی جھولے ڈالتی ہوں۔

آؤ کرشن! تم اگر اداس رہے تو سارا جگ اداس ہو جائے گا

میرا، سلمٰی، بوچی اداس ہو جائیں گی

میری، پیٹر اداس ہو جائیں گے

شاہین اور نغمہ اور نیلوفر اور پونم اداس ہو جائیں گی

لیلیٰ، شیریں، ہیر، جولیٹ، قلوپطرہ سبھی اداس ہو جائیں گی
ماں کا آنچل
بہنوں کے نینوں کے کاجل
باپ کی آنکھوں کا نور
بھائیوں کے تھکے پاؤں سب کے سب اداس ہو جائیں گے
آؤ کرشن چلو! اپنی بانسری کی سریلی آواز سے زندگی میں رنگ بھر دو۔
جہاں محبت ہی محبت ہو
جہاں پریت ہی پریت ہو!!

۱۱

ہات رے، ترا بھولپن

میں یونیورسٹی کی نیشنل سروس اسکیم کے تحت ان جھگی جھونپڑیوں میں رہنے والے مزدوروں کا سماجی و معاشیاتی سروے کررہا تھا، جو دور دراز کے دیہاتوں سے آکر کام کی غرض سے دلّی میں آباد ہوگئے تھے۔ ان میں زیادہ تر مزدور مدھیہ پردیش، بہار اور اڑیسہ کے پسماندہ علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ مختلف مزدوروں سے سوال پوچھ کر خانہ پُری کرنے کے بعد آخر میں ایک فارم بچ رہا تھا۔ یہاں میں عرض کردوں کہ مجھے نیشنل سروس اسکیم سے بڑی دل چسپی رہی ہے اور اکثر ایسا ہوا ہے کہ آخری فارم کو میں انتہائی انہماک کے ساتھ پُر کرتا ہوں۔ ہاں تو، شام ہونے لگی تھی۔ میں نے دیکھا ایک جھگی کی دہلیز پر ادھیڑ عمر کا پتلا دُبلا سا، لمبا سا ایک شخص بیٹھا بیڑی پی رہاتھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ فرصت سے ہے۔ میں نے اس کے قریب زمین پر بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔ ''آپ یہیں رہتے ہیں؟'' اس نے بتایا کہ وہ دو سالوں سے دلّی کی ان ہی جھگیوں میں رہ رہا ہے۔ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ''آپ کا نام کیا ہے؟''

''سکھ دیو'' اس نے لفظ سکھ پر زور دیتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ کس گاؤں سے آئے ہیں؟'' اس نے بتایا کہ وہ رائے پور کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے آیا ہے۔

گاؤں چھوڑ کر یہاں کس لیے آنا پڑا؟''

''صاحب! ایسا ہے کہ ....'' اب وہ ذرا کھل گیا اور مجھے اس کے اندازِ گفتگو سے یہ پتہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کافی باتونی اور دلچسپ آدمی ہے۔

''گاؤں میں بے کاری ہے، بھوک مری ہے، ہم مزدوری نہیں کریں گے تو کھائیں گے کیا۔ کھیتی کا کام تو سالوں بھر ملتا نہیں ہے۔ اپنے گاؤں میں پانی کی کوئی نہر بھی نہیں ہے۔''

''آپ اپنے گاؤں میں کیا کام کرتے تھے؟''

''صاحب کھیتی باڑی کا کام کرتا تھا۔''

کیا آپ کے اپنے کھیت تھے؟''

''نہیں صاحب! اپنا کھیت نہیں تھا، ہم دوسروں کے کھیتوں پر کام کرتے تھے۔''

اس قسم کے میں نے مختلف سوالات پوچھے جن کا بالواسطہ یا براہ راست تعلق ان کی سماجی و معاشی زندگی سے تھا۔ ان سوالوں کے اس نے جتنے جوابات دیے ان سے اس کے اندر کا چھپا ہوا کرب دھیرے دھیرے ابھر کر سامنے آنے لگا۔ یہ دیکھ کر اچانک میرے اندر کا فنکار جاگ اُٹھا۔ ایسے معاشی طور سے پچھڑے ہوئے اَن پڑھ اور غیر ہنرمند مزدوروں سے ان کے دل کی بات نکالنے میں بہت دقت تو ہوتی ہے، لیکن نہ جانے کیوں ان کے زخموں کو آہستہ آہستہ کریدنے میں مجھے بڑا مزا آتا ہے۔ میں نے اکثر ان کے زخموں سے فاسد مواد نکال کر باہر کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ ان کے جذبوں کی تطہیر ہو سکے۔ میں نے دیکھا سامنے ایک بچہ گولی چوٹ کھیل رہا تھا۔ جس کی عمر مشکل سے پانچ سال کی ہوگی۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

''یہ کون ہے؟'' اس نے بڑی دلچسپی لیتے ہوئے بتایا، ''یہ میرا بیٹا ہے۔''

''اور کتنے بچے ہیں، آپ کے؟''

''میرا کوئی نہیں ہے اس کے سوا ______ ''

''آپ کے ماں باپ؟''

''مر گئے۔''

''آپ کی پتنی؟''

میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے ______ '' اس نے قدرے چیخ کر کہا اور بیڑی کے لمبے لمبے کش لینے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ذہنی تناؤ کا شکار ہوتا جارہا ہے۔ میں نے اس کی پسند اور شوق پوچھے۔ حالانکہ یہ میرے سروے کے حوالے سے غیر ضروری سوال تھا۔ لیکن اکثر وبیش تر ایسا ہوتا ہے کہ اپنے آبجیکٹ کا موڈ بدلنے کے لیے کچھ دوسرے سوالات پوچھنے پڑتے ہیں، کیونکہ انسان کے ساتھ مشکل یہی ہے کہ وہ انسان ہے، مشین نہیں۔ اس کے سینے میں دھڑکتا ہوا دل ہوتا ہے، اور دماغ اسے ہر وقت سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

دل میں اگر جوش و امنگ ہوتو دماغ حسین خواب سجانے لگتا ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت سکھد یو کی تھی۔ اس نے اپنے پسند اور شوق کے متعلق بتایا کہ وہ اپنے بیٹے کو پڑھا کر بڑا آدمی بنانا چاہتا ہے تا کہ اسے اپنی زندگی میں کسی چیز کی کمی کا احساس نہ ہو۔ لیکن جوں ہی میں نے اس سے اپنے سروے کا آخری سوال پوچھا کہ ہمارے سماج میں جو برائیاں ہیں کبھی آپ نے سوچا، یہ کیوں ہیں، انھیں کس طرح دور کیا جاسکتا ہے۔ وہ سنتے ہی چراغ پا ہوگیا۔ لیکن جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے قدرے تیز آواز میں بولا۔

''دیکھئے صاحب ! ہم کو سماج سے کوئی مطلب نہیں۔'' میرا تجسس بڑھ گیا۔ میں نے خاموش رہ کر اسے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا پورا موقع دیا۔ ''میرا اس دنیا

میں کوئی بھی نہیں ہے اور نہ ہم کو کسی سے مطلب ہے، بھاڑ میں جائے سماج اور سماج کے لوگ۔'' وہ شاید سماج کے معنی صرف اس کے اپنے گاؤں کے لوگ ہی سمجھ رہا تھا۔ میں نے اسے قدرے وضاحت کرتے ہوئے کہا ــــــ ''آپ نے کبھی ایسا محسوس نہیں کیا کہ سماج میں عورتوں پر ظلم ہوتا ہے۔ وہ مردوں کے ساتھ مل کر کام کرتی ہیں پھر بھی انھیں ہر طرح کے ظلم سہنے پڑتے ہیں۔ وہ ہماری زندگی میں خوشیاں لاتی ہیں لیکن ہمارا سماج ان کی ذرا سی غلطی معاف نہیں کرتا اور جہیز کم لانے پر اسے جلا دیتا ہے، طرح طرح کے مظالم کرتا ہے۔ ان سب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ ایسا ہمارے سماج میں ہوتا ہے یا نہیں؟'' اس نے بڑے بے رحمانہ لہجے میں کہا۔ ''ان کے ساتھ جو ہوتا ہے، ٹھیک ہوتا ہے، وہ اسی لائق ہیں۔'' میں نے فوراً سوال کیا۔

''کیا آپ اپنی پتنی کے لیے بھی.....؟''

''صاحب! اس کے بارے میں تو مت ہی پوچھو۔ اس نے جیسا مجھے دھوکا دیا ہے کوئی ناری ایسا نہیں کرسکتی۔'' یکایک میرا تجسّس انتہا کو پہنچ گیا۔ میں نے دریافت کیا۔ ''کیا دھوکا؟ بیوی اور دھوکا، کچھ سمجھ میں نہیں آتا، بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

پتہ نہیں اس نے سنا یا نہیں مگر وہ آہستہ آہستہ ماضی کے سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔

میں نے اسے ہمیشہ خوش رکھنے کی کوشش کی تھی..... اس کے لیے میں نے ماں باپ کو چھوڑ دیا۔ اپنے رشتہ داروں میں شادی نہیں کی۔ اپنے حصے کے کھیت بیچ دیے۔ اس پر بھی وہ خوش نہیں ہوئی تو گاؤں چھوڑ کر نوکری کی کھوج میں شہر چلا آیا..... میں اپنی پتنی اور بچہ کے لیے ہر دکھ جھیلتا رہا..... میرے دوستوں کی بیویاں ان کے ساتھ مزدوری کرتی تھیں، لیکن میں نے اسے ہردم خوش رکھنا چاہا۔ میں نے اس سے پیار کیا تھا۔ مگر اس کے پیار میں کھوٹ تھا۔ پاپ تو اس کی گھٹی میں پڑا تھا۔ میرے دوستوں نے بتایا تھا۔ ٹھاکر منوج سنگھ کا لڑکا اس سے ملنے آیا کرتا تھا۔ میں

ان کی باتوں کو کب تک ان سنی کر سکتا تھا۔ دو سال تک کما کما کر پیسہ بھیجتا رہا۔ میرا بیٹا دو برس کا ہوگیا تھا، اس لیے خرچہ بھی بڑھ گیا تھا۔ دو سال بعد بغیر اسے خبر دیے، ایک رات چپکے سے، میں گھر پہنچ گیا۔

اس رات، شام ہی سے، ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ موسم سرد تھا۔ تیز ہوائیں درختوں کی بھیگی ہوئی شاخوں سے ہو کر سیٹیاں بجاتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ اندھیری رات میں لالٹین کی کانپتی ہوئی مدھم روشنی دروازے کی پھاٹوں سے چھن چھن کر باہر آرہی تھی۔ میں دروازے کے نزدیک گیا دفعتاً میرے کان کھڑے ہوگئے۔ اندر سے دو بھاری بھاری بے ہنگم سانسوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں فوراً کھڑکی کی طرف بڑھا، جس کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا۔ آہنی سلاخوں کے بیچ سے میں نے جوں ہی کمرے کے اندر ٹارچ کی روشنی پھینکی، میں اس دم بُت بن کر رہ گیا ـــــــ سامنے فرش پر ایک چٹائی کے اوپر دھنیا آنکھ موندے پڑی ہوئی تھی۔ اس کے بال چہرے اور کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے، کچھ ہی دور بچھی ہوئی چارپائی کے اوپر اس کی گھگری اور میلی کچیلی چولی پڑی ہوئی تھیں۔ کوئی اس کے سینے پر اس طرح جھکا ہوا تھا کہ اس کی ننگی پیٹھ صاف نظر آرہی تھی۔

یہ سب کچھ میری آنکھوں نے صرف ایک لمحہ میں دیکھا تھا۔ یہ دیکھ کر میرا خون کھول گیا۔ غصہ سے میری ٹانگیں کانپنے لگیں۔ میں نے اوسارے میں رکھی کلہاڑی اٹھا کر پوری طاقت سے دروازے پر دے ماری۔ دروازہ کھل گیا۔ ابھی ہاتھ اٹھا کر دوسرا وار کرنا ہی چاہتا تھا کہ دھنیا نے خوف سے اسی حالت میں آکر مجھے پیچھے سے پکڑ لیا۔ اس کے بدن سے انگارے پھوٹ رہے تھے۔ تبھی ٹھاکر کے لڑکے پر میرا وار ہو چکا تھا مگر دھنیا نے اسے بچا لیا۔ کلہاڑی الٹ کر مٹکے پر لگی۔ مٹکا ٹوٹ گیا، جس سے پانی نکل کر پورے فرش پر پھیل گیا، اب فرش تو دُھل چکا تھا لیکن ـــــــ وہ اپنا منھ کالا کیے بیٹھی تھی۔

دوسرے دن میں اسے چھوڑ کر اور اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر شہر چلا آیا۔

''لیکن، آپ نے گاؤں کے دوسرے لوگوں سے مدد کیوں نہیں مانگی، انھیں بتایا کیوں نہیں؟''

''صاحب! میں نے کہا نا، میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔'' اس کی آواز میں درد تھا۔

''میں نے گاؤں کے ایک ایک بزرگ سے کہا، لیکن ٹھاکر سے دشمنی کون مول لیتا'' تھوڑے سے توقف کے بعد وہ پھر گویا ہوا۔

''سب نے میری دھنیا پر ہی الزام لگایا ــــــ وہ بدچلن ہے۔'' اس کی آواز کانپنے لگی۔ تھوڑی سی خاموشی کے بعد اس نے فکرمند لہجہ میں کہا۔ جانے کہاں ہوگی ..... بے چاری۔'' وہ دور خلاؤں میں گھور رہا تھا۔ اس کی زبان سے نکلا ہوا محسوس ہو رہا تھا ــــــ '' اس کے بھولپن نے اسے کہیں کا نہ چھوڑا ــــــ ایسا لگتا ہے، کل ہی کی بات ہے۔ سارا منظر آنکھوں میں گھوم جاتا ہے، اپنا گھر دوار تھا، بچہ تھا..... اگر چاہتی تو کیا اور نہ ہوتا۔''

''کیا اسے اپنے بچے کی یاد بھی نہیں آتی؟''

''پتہ نہیں، صاحب! اس ظالم سماج نے تو اس معصوم سے اس کی ممتا تک چھین لی۔''

شام ڈھلنے لگی تھی، شام کا دھندلکا تیزی سے پھیلتا جا رہا تھا۔ میں نے اپنے کاغذ پتّر سمیٹے اور اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے آخری بار اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی تو متحیر رہ گیا ــــــ جہاں کچھ دیر پہلے تک نفرت کی چنگاریاں بھڑک رہی تھیں۔ اب وہاں، ان آنکھوں میں درد بھرے آنسوؤں کے قطرے تیر رہے تھے۔

۱۲

کتنا دلکش ہے یہ فریب محبت

یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ ہندوستانی زبانوں کے مرکز کے تحت میں ایم۔ اے کورس میں تھا اور میری پروگرامنگ اردو تھی۔ میں نے زندگی کا بڑا حصہ گھر پہ رہ کر گزارا تھا جہاں باپ کی شفقتیں تھیں، ماں کی ممتا تھی، بھائیوں اور بہنوں کا پیار تھا اور بھابیوں اور بہنوں کی نندوں کی دلچسپ باتیں تھی، لیکن ... ہوسٹل کی زندگی بالکل روکھی پھیکی تھی، چوبیسوں گھنٹے لڑکوں کے ساتھ رہنا، جہاں سبھی بیچلر لڑکے ہوں وہاں عجیب سی فضا ہوتی ہے، صنفِ نازک اور وجودِ زن کی عدم موجودگی کانٹوں کی طرح چبھتی تھی۔ خصوصاً میری کلاس میں تو ویرانی سی ویرانی تھی۔ بیس لڑکوں میں ایک خاتونِ مشرق تھیں جسے دیکھنے کے بعد 'کچھ' بھی نہیں ہوتا تھا۔ پہلے سمسٹر میں بڑی کوشش کی کہ کسی ماہِ رخ کا قرب نصیب ہو جائے لیکن کچھ نہ ہونا تھا کچھ نہیں ہوا۔

دوسرے سمسٹر میں میں نے توبہ کرلی اور فیصلہ یہ کیا کہ اب نہ کسی سے دل

لگائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی پابندی سے یونیورسٹی کی سینٹرل لائبریری جانے لگا لیکن ..... ابھی توبہ کی ہی تھی کہ جام پہ جام بڑھنے لگے۔

لائبریری کے پانچویں فلور پر جارہا تھا کہ اچانک دوسری منزل پر لفٹ رک گیا، لفٹ کا دروازہ کھلا تو دل پر ایک زبردست جھٹکا لگا۔ جھکی ہوئی بڑی بڑی غلافی آنکھوں کے اُوپر سے پلکیں اٹھیں، آنکھیں چار ہوئیں اور کوئی برق سی پورے جسم میں دوڑ گئی، سانسیں تیز ہوگئیں، وہ سراپا پری وش لفٹ کے کمرے میں داخل ہو چکا تھا، ایک ساعد سیمیں اٹھا..... مخروطی انگلیاں، ان پر بڑے سلیقے سے تراشے ہوئے گلابی ناخن ..... اس نے لفٹ کا بٹن دبایا اور مجھے محسوس ہوا گویا کسی نے ان ناخنوں کو میرے دل میں چبھو دیے ہوں۔

ریڈنگ روم میں بیٹھ کر کتاب کھولے کھڑکی سے باہر دور خلاؤں میں دیکھ رہا تھا اور ذہن پوری طرح اس پری جمال کے حسن کی بھول بھلیوں میں الجھا ہوا تھا، پتلی لیکن بھاری گاڑھے رنگ کی قیمتی اسکرٹ کے اوپر جیکٹ، شولڈر تک بال، ایک ہاتھ میں ننھا سا خوش رنگ ملائم رومال، نشیلی اور سحر آگیں آنکھیں ..... میں سوچنے لگا، شاید ایسے ہی نازک مرحلے سے پٹ کر سودا نے کہا ہوگا ۔

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

شیکسپیئر کی پورشیا اور وڈز ورتھ کی لوسی حسین تھیں، پر اتنی حسین کہاں ہوں گی؟ سارا وقت ان ہی خیالوں میں بیت گیا۔

واپسی میں عجب اتفاق کہ پھر لفٹ رُکا، دروازہ کھلا اور وہ گل اندام سمٹا سمٹایا کمرے میں داخل ہوگیا، گراؤنڈ فلور پر میں، دور تک اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔ مور کی طرح اس کا چلنا، میں نے سوچا مور بھی اتنا سبک خرام کہاں ہوگا؟ گوری گوری پنڈلیاں جاپانی گڑیوں کے جیسے ننھے ننھے خوبصورت پاؤں ..... میں دیر تک

دیکھتا رہا حتیٰ کہ وہ ماحول کی دھند میں گم ہو گئی۔

میں نے ہوسٹل آ کر انظار سے بتایا جو کہ میرا انتہائی قریبی دوست تھا۔ کہنے لگا ''یار! کمال کرتے ہو، ایک ہی نظر میں تمھیں عشق ہو گیا؟'' میں نے کہا، ''یہ تو میرا دعویٰ ہے۔'' میں نے ذرا شوخی سے کہا، ''جسے میں آنکھ بھر دیکھ لوں، 'ہاں' اور 'نا' کا فیصلہ اسی دم آنکھوں آنکھوں میں ہو جاتا ہے۔''

اب اکثر ایسا ہوتا کہ ہماری نگاہیں لڑ جاتیں اور عجب اتفاق تھا کہ روز لفٹ پر ایک بار ضرور ملاقات ہو جاتی تھی۔ ان آنکھوں میں چھپی ہوئی دعوتِ مے نوشی دیکھ کر میرا احساس تشنگی اور بڑھ جاتا۔ رفتہ رفتہ ہم دونوں ایک دوسرے کی عادت اور اداؤں سے مانوس ہونے لگے۔ وہ اب مجھے تشنہ لب دیکھ کر خرامِ ناز سے زمین پر ٹھوکریں مارتا ہوا چلتا اور کسی شوخ ساقی کی طرح زیرِ لب تبسم بکھیر دیتا۔

مجھے اب ''کچھ کچھ'' ہونے لگا تھا۔ میں ہر روز شیو کرتا، ہر روز نئی ٹائی بدلتا، دیر تک بال سنوارتا، اس کے بعد ہی لائبریری جایا کرتا تھا۔ اب مجھے پرفیوم لگائے بغیر لائبریری جانے میں اچھا نہیں لگتا تھا۔ لڑکوں میں کم کم بیٹھنا اور الگ الگ رہنا۔

ایک دن اقبال، میرا دوست جو واقعی اسمارٹ ہے کہنے لگا۔ ''یار! اس سمسٹر میں تم میں بڑی تبدیلی آئی ہے۔ مذاق نہیں سچ کہہ رہا ہوں تم جب سوٹ پہن کر آتے ہو تو بڑے اسمارٹ لگتے ہو۔''

''چھوڑو بھی یار! کیوں صبح صبح چاٹ رہے ہو۔'' میں نے اسے فوراً ٹال تو دیا لیکن اس کا آخری جملہ میرے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا۔

مجھے خود بھی ان تبدیلیوں کا احساس ہونے لگا تھا، پچھلے سمسٹر میں میں دو دفعہ ملیریا کا شکار ہو چکا تھا لیکن اس سمسٹر میں میری صحت لگ رہی تھی، لڑکے میرے بارے میں کہنے لگے تھے کہ شاہد حسین ان دنوں خوب پڑھ رہا ہے اور یہ سچ تھا کہ میرا زیادہ وقت لائبریری میں گزرنے لگا تھا یہ اور بات ہے کہ وہاں بیٹھا نصاب کی

کتاب پڑھنے کے بجائے کتابِ عشق کی ورق گردانی میں مصروف رہتا تھا۔

وہ نازک اندام ہر وقت میرے خواب و خیال میں میرے حواس پر چھایا رہنے لگا۔ اسے دیکھتا تو دل میں عجیب ہلچل سی ہونے لگتی۔ میں اکثر سوچا کرتا کہ ؎

بخشے ہے جلوۂ گل، ذوقِ تماشہ غالبؔ
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

لیکن جب کبھی اس خیال کے ساتھ دیکھتا تو اس کی شعلہ بار آنکھوں کی تاب نہ لاکر میری نگاہیں جلد ہی جھک جاتی تھیں۔ آنکھوں آنکھوں میں یہ سلام و پیام چل رہے تھے اور میں اس کی ہر ہر اداؤں پہ سو سو جان سے قربان ہو رہا تھا۔

ڈیسک کیلنڈر پر تاریخ کے اوراق خلافِ معمول قدرے تیزی سے الٹ رہے تھے کہ ایک دن جب دم توڑتے ہوئے جاڑے کی سرد رات تھی تقریباً گیارہ بجے میں گنگا ڈھابے سے کافی پی کر جھیلم لان سے گزرتا ہوا چلا آرہا تھا۔ گلوں پر بہار کی آمد آمد تھی۔ ایسے میں بقول اقبال آشیاں میں ٹھہرتے نہیں تھے طیور۔ لڑکیوں کے گنگا ہوسٹل کے سامنے پھولوں کے خیابانوں سے بھینی بھینی مختلف النوع خوشبوئیں آرہی تھیں، بسیط لان میں چاندنی انگڑائیاں لے رہی تھی، شب نم ہوتی جارہی تھی کہ چلتے چلتے اچانک جیسے کسی نے میرے قدم روک لیے ——— سامنے درخت کے سائے میں چھوٹی چھوٹی چٹانوں پر جوان جوڑے ہم آغوش تھے۔ میرے قدموں کی آہٹ پاتے ہی ان کی سرگوشیاں تھم گئیں، یہ کوئی نئی بات نہ تھی، لیکن .... میرے خوابوں کا شیش محل یکلخت وہیں چکنا چور ہوگیا۔

میرا معصوم قاتل کسی کی آغوش میں بے قراری سے مچل رہا تھا۔

شاید اس نے مجھے دیکھ لیا تھا، میں پاؤں پٹکتے ہوئے وہاں سے جلد سے جلد اپنے کمرے میں چلا آیا، رات بھر میں کروٹیں بدلتا رہا۔

"دنیا میں تقدس نام کی چیز نہیں، ہر جگہ دھوکا ہے، محبت کا وہ مقدس جذبہ دنیا

سے ناپید ہو چکا ہے۔ ہر خوبصورت پھول کے پیچھے کوئی افعی چھپا بیٹھا ہے جو اس کے پرستاروں کو کسی بھی پل ڈس سکتا ہے۔''

دوسرے دن بادل ناخواستہ میرے قدم لائبریری کی طرف اٹھ گئے۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ اب اسے نگاہ بھی اٹھا کر دیکھوں گا نہیں۔ انظار ٹھیک کہتا تھا، مجھ ہی سے غلطی ہوئی کہ میں نے اسے اپنا سا سمجھ لیا تھا۔ دفعتاً میں نے دیکھا، وہ سامنے سے گزری لیکن میں نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر وہ میرے سامنے پل بھر کو رکی اور آگے بڑھ گئی۔ اب مجھے اس کی ان حرکتوں سے وحشت سی ہونے لگی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھے رجھانے آئی ہے۔ لیکن میں نے بھی قسم کھا رکھی تھی کہ اس مکر و فریب بھری آنکھوں کی طرف نگاہ اٹھا کے بھی نہیں دیکھوں گا۔ میں ورق گردانی میں مصروف ہو گیا۔ کافی وقت گزر گیا تو یکا یک مجھے آہٹ ملی جیسے کوئی میری کرسی کے پیچھے کھڑا ہو۔ یکا یک مڑ کر دیکھا تو ..... عجیب ملی جلی کیفیت سے دل تڑپ کے رہ گیا۔

وہ میرا قاتل!

میرا مسیحا!! ..... جانے کب سے میری پشت پر کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا ..... اس کی سرخ ڈورے پڑے بے خواب آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

''جی ہاں! وہ اشکِ ندامت ہی تھے۔'' اُن بیش بہا آنسوؤں کے قطروں کو میں نے اپنی انگلیوں میں جذب کر لیا اور ہمیشہ کے لیے انھیں حوادثِ زمانہ سے محفوظ رکھنے کی قسم کھا لی۔

۱۳

نیا سورج نیا سویرا

سورج کی لطیف کرنیں پڑتے ہی بھولا کی آنکھیں کھل گئیں۔
اسے پہار جنگل گاؤں سے آئے ہوئے تین ماہ ہوچکے تھے۔ اس نے ایک بھرپور انگڑائی لی، وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ دلّی کا فٹ پاتھ ابھی سو رہا تھا۔ ابوالکلام آزاد کے مزار کے سامنے والے پارک کے کونے پہ چائے کے ڈھابے میں کچھ رکشہ بان زمین پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کتوں کے کھانے والے بسکٹ تھے، جسے چائے میں ڈبوڈبو کے وہ سب کھاتے جاتے تھے۔ اس نے اٹھ کر اپنی پھٹی ہوئی میلی سی چادر سرہانے سے نکال کر نالے کی سلیب پر لٹکا دی تاکہ دھوپ اندر نہ آنے پائے۔ اس کی نگاہ اس نالے سے بڑھتی ہوئی جہاں اس جیسے کئی انسان راجدھانی کی بلند عمارتوں سے بے نیاز اپنے پھٹے میں مست نالے کے پکّے فرش پر پڑے ہوئے تھے، زینوں تک گئی اور پھر زینہ بہ زینہ جامع مسجد کے عالی شان اونچے دروازے پر جاکر ٹک گئی۔ پھر مسجد کے گنبدوں سے ہوتی ہوئی جامع مسجد کے میناروں کی انتہائی بلندیوں پر جاکر ٹک گئی

جہاں کئی جوڑے آزاد کبوتر بیٹھے گویا وقت کی کوکھ سے نکلنے والے نئے سورج کے منتظر تھے۔

یکا یک اس کا ذہن سلطانہ کی طرف چلا گیا۔

اس نے بھی کبھی نئے سورج کی تمنا کی تھی، وہ مغرور نہیں تھی، وہ اسے چاہتی تھی۔ اس کے بچپن کی دوست تھی، وہ اس کے ساتھ شادی بھی کرنا چاہتی تھی لیکن وہ مومن تھی بھولا مانجھی تھا۔ بھلا عظمت میاں اپنی بیٹی کی شادی اس کے ساتھ کیسے کر سکتے تھے۔ آخر ایک دن اس کی سگائی ہوگئی۔ وہ چلی گئی لیکن ایک خلش دے گئی جو آج بھی اس کے سینہ میں اضطراب بپا کر دیتی ہے۔ جب کبھی اس کی یاد آتی ہے ایک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے۔ ایک میٹھی کسک اسے ایک دم بے چین کر دیتی ہے..... وہ کتنا تندرست تھا۔ اس کے اپنے کھیت اور بیل تھے۔ اس کی گائیں بھی تھیں وہ سویرے خود ہی دودھ دوہا کرتا تھا، کھانے میں اس کی ماں اس کے لیے چھاچھ بنا دیا کرتی تھی۔ اب نہ ماں رہی نہ کھیت رہے نہ ہل بیل اور نہ گائیں۔ سب کا سب وقت نے اس کے ہاتھوں سے چھین لیا، وہ تو بھلا ہو چودھری جی ساہوکار کا جو کہ انھوں نے قرض کی وصولی میں زیادہ سختی نہ کی ورنہ وہ کہاں جاتا اور کہاں سے لاکر ان کے پیسے دیتا۔ بابو جی کے مرنے کے بعد تو بڑے بھائی نے شراب کی بری لت کے کارن اسے کہیں کا نہ چھوڑا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا، پرکھوں کے آباد کیے ہوئے آم کے باغات، مہوا، کیندو، کسم، شال اور پلاش کے جنگلات، سال بھر بھرا رہنے والا کنواں سب کچھ چھوڑ کر آ گیا۔ کیا خبر تھی، یہ دن دیکھنے پڑیں گے۔ اس نے تو سنا تھا کہ نوکری مل جاتی ہے مگر یہاں تو ایماندار آدمی کا گزارہ نہیں۔ ٹھگوں، بے ایمانوں کی دلّی دلبر بنی ہے۔ ایماندار محنتی آدمی کو کوئی پوچھتا نہیں۔

اس نے بھوک کی شدت سے بے حال ہو کر جب کروٹ بدلا تو نالے کی دیوار کے اوپر سے لال قلعے کی اونچی فصیل نظر آ رہی تھی، جہاں آزاد بھارت کا پرچم لہرا رہا

تھا۔ اس نے پھٹی ہوئی چادر کی سوراخ سے دیکھا۔ ایک موٹا سا بڑی توند والا شخص، جو شکل اور لباس سے کوئی سیٹھ معلوم ہوتا تھا، بغل میں چمڑے کا بیگ دبائے کھڑا پیشاب کر رہا تھا۔ اس نے سوچا، ذیابیطس کا مریض ہے شاید اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔ پیشاب کی بدبو کا ایک زوردار بھبکا آیا اور اس کے نتھنوں میں سرایت کرتا ہوا گزر گیا۔

اسے یکلخت کامنی کی جھگی یاد آگئی۔ جب وہ پہلی دفعہ گیا تھا۔ جھگی شہر کے کوڑا کرکٹ اور پتھر غلاظت کے ڈیرے سے لگی اونچائی پر بنی ہوئی تھی۔ وہاں سات آٹھ جھگیاں تھیں، چھوٹی چھوٹی، سور کے باڑوں جیسی، پتھر مٹی اور ٹکڑے اینٹوں کی بنی ہوئیں، اوپر پولی تھین کی چادر ڈال دی گئی تھی تاکہ برسات میں پانی نہ ٹپکے۔ وہاں اسی طرح بدبوؤں کا بھبکا آتا تھا۔ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ متلی پیدا کرنے والی بدبو، اسے گاؤں کے سہانے دن یاد آگئے۔ جب وہ اپنے تالاب کے کنارے والی پھلواری سے گزرتا تھا موتیے اور بیلے کی خوشبو اس کے قدم روک دیتی تھی۔ وہ سلطانہ کے بالوں میں سجانے کے لیے پھول توڑ لیا کرتا تھا۔ مگر اب تو سلطانہ اس کی زندگی کی ویرانیوں سے بہت دور جا چکی تھی۔ اس نے محسوس کیا لیکن کامنی بھی بری لڑکی نہیں ہے۔ اس کے تراشے ہوئے بال اس کی بڑی پیشانی پر اچھے لگتے ہیں۔ وہ میک اپ کرتی ہے تو کیا ہوا شہر میں تو ہر کوئی میک اپ کرتا ہے۔ وہ تارکول سے زیادہ کالی ہے تو کیا ہوا اس کے تیکھے ناک نقشے پوری دلّی میں ڈھونڈنے سے نہ ملیں گے۔ تب ہی تو اس کی جھگی میں چائے پینے کے لیے آٹو رکشا ڈرائیور تک آتے ہیں لیکن وہ سب سمجھتی ہے۔ وہ کسی کو اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیتی جبکہ اسے پہلی ہی بار میں اس نے اپنی چارپائی پر بٹھایا تھا۔ اس کا نام پوچھا تھا اور بغیر مانگے اسے اپنے ہاتھوں کی بنی ہوئی چائے پلائی تھی اور ان سب چیزوں کو دیکھ کے منگلو اس پر رشک کرنے لگا تھا ویسے منگلو رڈی کاغذ اور پولی تھین ضرور چنتا تھا لیکن اسے اچھے

برے کی پہچان تھی۔ تب ہی تو اس نے دو تین دنوں کے اندر ہی اندر اسے آدھا شہر گھوما دیا تھا ورنہ دلّی جیسے بڑے شہر میں تو کوئی پوچھنے سے بھی نہیں بتاتا کہ کون سی گلی کہاں نکلتی ہے اور پھر ان پڑھ دیہاتیوں کے لیے تو بس کا سفر بھی محال ہے۔ سرکار نے غریبوں کے لیے سستے کرائے کی بس تو چلوا دی لیکن اسے اتنا کٹھن بنا دیا ہے کہ صرف پڑھے لکھے بابو لوگ ہی سفر کر سکتے ہیں۔

وہ سوچنے لگا۔ منگلو واقعی اس کا جگری دوست ہے ورنہ اگر وہ نہ ہوتا تو مچھلی گودام میں سڑی مچھلیوں کے ٹوکرے ڈھوتے ڈھوتے وہ بیمار پڑ جاتا۔ اس کے پھیپھڑوں میں ٹھنڈک لگ جاتی۔ برف بھرے کمروں میں چلتے چلتے اس کے پاؤں سوجن سے پھٹ پھٹ گئے تھے۔ مالک پیسہ دیتا تھا اور نہ ہی جانے دیتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ پردیسی ہے کچھ نہیں کر سکتا، لیکن خیر منگلو نے بیماری کا بہانہ بنانے کا اسے کامیاب نسخہ بتا دیا تھا جس پر عمل کر کے وہ بچ نکلا۔ اسی طرح ہوٹل کے کام سے بھی نجات ملی ورنہ دھوتے دھوتے ہاتھ سے چھوٹ کر پلیٹ کیا ٹوٹ گئی، وہ مار مار کر اس کی کمر توڑ دیتے اور موٹی موٹی گالیاں جو سننی پڑی تھیں وہ الگ۔ اسے اتنی مار پڑتی کہ وہ کسی سرکاری اسپتال کی سیڑھیوں پر بھوک سے بلک رہا ہوتا۔ یہ سب منگلو کے خلوص کا نتیجہ ہے کہ آج وہ آزاد ہے اور جب اور جہاں جی چاہے جا سکتا ہے، کام کر سکتا ہے اور جب جی چاہے سو سکتا ہے۔ اس کے اب تو تین تین ڈیرے ہیں۔ ایک یہی جامع مسجد کے نالے کے اندر دوسرا پرانی قبرستان کی وہ ہری دیوار والی قبر اور تیسرا ڈیرہ تو سورگ سمان ہے سورگ .... کامنی کی جھگی۔ کامنی اسے اچھی لگتی تھی۔ وہ جب اس سے باتیں کرتی تھی تو اس کے ہونٹ کے بالائی زاویے میں ہلکی سی دلآویز جنبش ہونے لگتی تھی، اور ساتھ ہی تبسم کی ایک ہلکی سی لکیر اس کے ہونٹوں پر رینگ جاتی تھی۔ اس کے گال کتنے بھرے بھرے سے تھے۔ کامنی بھی اسے چاہتی تھی تب ہی تو ایک دن، جب وہ اپنے پولی تھین کے تھیلے کو رکھ کے جس میں کھٹے

باسی پلاؤ، ڈبل روٹیاں، سڑے ہوئے ملک کریم، جوٹھے آم لیٹ، مرغ کے گوشت، سیب کے چند ٹکڑے اور بہت سارے باسی سلاد تھے، وہ کوڑا کرکٹ کی ڈھیر سے پرانے کاغذ چن رہا تھا کہ اتنی دیر میں آٹھ دس موٹے موٹے بھورے رنگ کے سوروں کا ایک غول کیچڑ پٹی کے عقب سے نمودار ہوا اور اس کے تھیلے کو کھینچ تان کرنے لگا تھا اور وہ ان سے اپنا کھانے کا تھیلا چھڑانے میں خود کو انتہائی بے بس و ناچار محسوس کر رہا تھا کہ اتنے میں کامنی آگئی تھی اور اس نے سوروں کے منہ سے کس کر تھیلا چھڑا لیا تھا۔ اس چھینا جھپٹی میں وہ گٹر میں گرنے سے تو بچ گیا تھا مگر اس کی ہتھیلی کے پشت پر سور نے پنجہ مار دیا تھا جس سے خون بہہ نکلا تھا۔ اس کے کھانے کا تھیلا پھٹ گیا تھا جس سے سارے کھانے نکل کر بکھر گئے تھے۔ اس وقت کامنی نے اس پر اپنے ہاتھوں سے اپنی پرانی ساڑی کا کنارا پھاڑ کر باندھ دیا تھا، اس روز وہ اسے بہت اچھی لگی تھی۔

وہ کامنی کی نرم تکیہ پر اپنا سر رکھ کر سویا ہوا تھا اور وہ جب چائے گرم کر رہی تھی۔ اس دم اسے لگا تھا سورگ اسی دنیا میں ہے اور اپسرائیں بھی یہیں بستی ہیں۔ اس کا خیال تھا سورگ ایک خوشی کے احساس کا نام ہے جو اصل میں خود انسان کے اندر ہوتا ہے لیکن جلد ہی اس نے اس خیال کو ذہن سے نکال دیا تا کہ اس طرح سوچنے سے کہیں پاپ نہ ہو۔ دفعتاً منگلو بھی اس کی جھگی میں داخل ہوا تھا اور اسے اس بے تکلفی سے لیٹا ہوا دیکھ کر بوکھلا سا گیا تھا۔ جھگی میں منگلو کے گھسنے کے بعد روشنی کی آمد بالکل بند ہوگئی تھی۔ اسے گھٹن سی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ باہر کھلی ہوا میں آگیا تھا۔ اسے یاد ہے تب ہی سے منگلو اس سے کھینچا کھینچا سا رہنے لگا تھا۔

وقت کا مصور کینوس پر رنگ بھرتا رہا اور ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے جگہ بنتی گئی۔ حتیٰ کہ ایک دن بھولا نے اسے وہ چاندی کی گھنگھرو لگی ہوئی انگوٹھی اپنی بنیان سے صاف کر کے پہنا دی جو اُسے کوڑے دان سے ملی تھی۔ وہ انگوٹھی

اسے بڑی ہوتی تھی۔ اس نے اس کی رنگ میں دھاگے لپیٹ دیے تھے۔ تبھی کامنی نے بے حد جذباتی ہوتے ہوئے کہا تھا، ''بھولو! تو میرے لیے لال جوڑا کب لائے گا؟ میں اس انگوٹھی کو تبھی پہنوں گی جب تو میرے لیے لال جوڑا بھی لائے گا۔''

لیکن اس کے پاس اتنے پیسے کہاں بچتے تھے کہ وہ سرخ جوڑا خریدتا، اس نے ذہن پر کافی زور دیا تو راستہ سوجھ ہی گیا۔ اس نے پرانی قبرستان میں رہنے والے گورکن کے ہاں سے چار گز بچے ہوئے کفن کے کپڑے خریدے تھے اور انھیں خود اپنے ہاتھوں سے سرخ رنگ سے رنگا تھا۔

دفعتاً اسے یاد آیا۔ وہ کپڑے بندو درزی کے پاس پڑے تھے۔ آج اسے جا کر لانا تھا۔ کل ہی تو اس کی شادی ہونے والی تھی۔ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا، دفعتاً نالے کی سلیب سے سر پر ایک زور دار ٹکر لگی اور وہ اپنا سر سہلاتا ہوا باہر نکلا اور ایک جاتے ہوئے شخص سے اُس نے پوچھا، ''بھائی صاحب! کل پندرہ اگست ہے نا؟'' ''ہاں'' مسافر جواب دیتا ہوا آگے نکل گیا۔ اس نے وقت کا اندازہ لگایا کوئی دس سوا دس کا وقت تھا۔ وہ اپنا بڑا سا بورا پیٹھ پر رکھ کر بندو درزی کے پاس جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ جب وہ بندو درزی کے پاس پہنچا تو اس نے بتایا کہ تم نے تو ابھی تک ناپ دیا ہی نہیں ہے، اس لیے کپڑے نہیں سلے ہیں تو وہ سکتہ میں پڑ گیا۔ اب کیا ہوگا؟ اس نے واقعی ناپ نہیں دیا تھا اور ناپ دیتا بھی کیوں کر کامنی کے پاس تو ایک ہی شلوار قمیص تھی۔ جاتے وقت بندو نے کہا، ''یہ کپڑے بھی لیتے جاؤ، جب ناپ مل جائے تب ہی لے کر آنا۔''

وہ سرخ کپڑے لے کر وصالِ یار کے تصور میں مگن بھاگتے بھاگتے لال باغ کی جھگیوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کامنی کا سراپا اس کے خیالوں میں گھوم رہا تھا وہ بھرا بھرا سا سلونا بدن ابلا پڑتا تھا۔ کپڑے کثرتِ استعمال کی وجہ سے جگہ جگہ سے گھس گئے تھے اور وہ میلے ہو کر عجب دلکش انداز میں نمایاں ہو گئے تھے .... اچانک

اسے دور سے دھواں اٹھتا ہوا دکھائی دینے لگا، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ معاملہ کیا ہے، تب ہی اس نے دیکھا لال باغ کی جھگیاں آگ کے شعلوں میں جل رہی تھیں اور سامنے سیٹھ کروڑی مل اپنے ہفت منزلہ ہوٹل سوریہ محل کے گیٹ سے کھڑا تماشہ دیکھ رہا تھا۔

معاً اس کے ذہن میں کامنی کے جملے گونج اٹھے۔

''سیٹھ کروڑی مل یہاں سے ہماری جھگیوں کو ختم کرنے والا ہے کیوں کہ ان جھگیوں کی وجہ سے اس کے ہوٹل کا جہاں دنیا بھر کے بڑے بڑے لوگ آ کر ٹھہرتے ہیں، شو خراب ہو جاتا ہے۔ میں کہیں چلی گئی تو اس مُرلی پان والے بھیا سے میرا پتہ پوچھ لینا، میں اسے بتا کر جاؤں گی۔''

بھولا کو معاملہ فہمی میں دیر نہ لگی، اپنی بستی ہوئی دنیا کو یکا یک اجڑتی دیکھ کر وہ دیوانہ وار چلا اٹھا۔

''نہیں کامنی نہیں، تو مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔''

''کامنی''

''کامنی ..... کامنی ..... کامنی .....!''

اس سے پہلے کہ آگ بجھانے والا ڈمکل وہاں پہنچتا جھگیوں میں جلتے ہوئے انسانوں کی چیخ و پکار ہمیشہ کے لیے بند ہو چکی تھی اور جب شہر خموشاں کی سی خاموشی طاری ہو چکی تو فائر بریگیڈ والے ان بجھی ہوئی چنگاریوں کو بجھا کر، سیٹھ کروڑی مل جی سے بخشش پا کر واپس چلے گئے تھے۔ ابھی لاشیں سڑی نہیں تھیں یا سیٹھ کروڑی مل نے فون نہیں کیا تھا، شاید اسی لیے کارپوریشن کی گاڑی نہیں آئی تھی۔ اکا دکا لوگ جو رہ گئے تھے دور سڑکوں کے کنارے کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ بھولا اپنی آنسو بھری نظروں سے اس کی جھگی کا راستہ بناتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور پھر اس نے اپنی کامنی کو ڈھونڈ ہی نکالا۔

"کامنی! دیکھ میں تیرے لیے لال جوڑا لے کر آیا ہوں، کامنی تو نے کہا تھا نا، دیکھ میں تیرے لیے کپڑے لے کر آیا ہوں، تو نے تو جنم جنم نبھانے کا، ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی تو اتنی جلدی چل دے گی تو ایسی بے وفا نکلے گی۔"

"نہیں تو بے وفا نہیں ہو سکتی!" ——— ۔ وہ پاگلوں کی طرح تنہا بکنے لگا۔
"بے وفا تو سیٹھ ہے .... کروڑی مل .... سوریہ محل ہوٹل کا مالک .... جس نے تجھے اتنا بھی موقع نہیں دیا کہ تو اس پھیلی ہوئی دھرتی پر اپنا ایک چھوٹا سا گھر بسا سکے۔"

اس نے اس رنگے ہوئے پرانے کفن کے سرخ کپڑے سے کامنی کا سوختہ جسم اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے ڈھانپ دیا۔

شام کی سرمئی تیزی سے گہری ہوتی جارہی تھی بھولا نے سوریہ محل ہوٹل کی ساتویں منزل کی جانب کروڑی مل کی طرف قہر آلود نگاہوں سے گھورتے ہوئے دیکھا اور معنی خیز انداز سے بدبدایا۔

"کروڑی مل! تو اس رات کی سیاہی میں زیادہ دیر تک اپنا منہ نہیں چھپا سکتا، مظلوم کی آہ خالی نہیں جاتی، مظلوم کے خون سے بہت جلد ہی ایک نیا سورج اگے گا جو تیرے کالے کرتوتوں کا پردہ فاش کر دے گا۔ تب یہ مظلوم تجھے .... یاد رکھ .... ہرگز ہرگز نہیں بخشیں گے۔"

اور پھر اچانک شدتِ غم نے اس کی زبان گنگ کر دی۔ وہ فی الفور شانت ہو گیا۔

۱۴

چمبل کی دسویں رانی

اونچے اونچے چٹانوں سے گھرے، گھنگھور جنگلوں والے کوہستان میں ایک نہایت ہی خوبصورت اونچے قد کی نازنین مردانہ لباس میں ملبوس بڑی عاجزی سے چمبل کا انتظار کر رہی تھی۔

یکا یک اس کا ذہن حال کی قید سے بغاوت کر کے ماضی کی طرف فرار ہوگیا۔

اس کے آنگن میں ایک خوفناک بندوق کی آواز ہوئی تھی۔ جسے سنتے ہی وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔ آنکھ کھلی تو اس چمبل گھاٹی میں وہ چمبل کے پہلو میں پڑی تھی۔ اسے پہلے پہل چمبل کی کڑیل مونچھوں کے نیچے سفید چمکیلے دانت دیکھ کر بہت خوف لگا تھا۔ بڑی بڑی اور سرخ شرابیوں کی سی آنکھیں اور ہاتھوں میں غیر ملکی شراب کی بوتل تھی۔ لیکن دھیرے دھیرے وہ ان سب اشیا کی عادی ہوتی گئی۔ اب اسے وہ خوفناک بندوق بھی عزیز تھی ـــــــ فرصت کے اوقات وہ بندوق لے کر جنگلی جانوروں کا شکار کرنے نکل جاتی۔ پہلے تو اسے بندوق چلانا نہیں آتا تھا لیکن وقت نے سب کچھ سکھا دیا اور اب وہ ایک غیر معمولی نشانہ باز تھی۔

ایک دن چمبل لُوٹ کا مال چھپانے کی غرض سے اپنے غار کی طرف جا رہا تھا اسی وقت ایک زور دار دھما کہ ہوا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو نویں رانی کے ہاتھ میں بندوق تھی اور تقریباً ایک فرلانگ کی دوری پر ایک جنگلی جانور تڑپ رہا تھا۔ چمبل ایک زور دار قہقہہ لگائے بغیر نہ رہ سکا۔ مال رکھ کر اس نے نویں رانی کو اپنی بانہوں میں لے لیا تھا اور جذبات کی رو میں بہہ کر کہنے لگا کہ آج تک تو میں کنوارہ ہی رہا پر سوچتا ہوں کہ تم سے شادی کرلوں۔ رانی شرما کر سمٹ سی گئی تھی۔ اس نے رانی کو خوش کرنے کے لیے کہا تم تو آج کل بہت نشانے باز ہوگئی ہو۔ اگر تم کسی اڑتے ہوئے پرندے کو مار گراؤ تو میں کل سے تمھیں بھی اپنے ہمراہ لے جاؤں گا، چلوگی نا.....! دوسرے ہی لمحہ گولی کی آواز کے ساتھ پرندہ زمین پر تھا۔

شام کے وقت جب وہ شکار سے دل بہلا کر واپس لوٹ رہی تھی تو اس نے اس بوڑھے ڈاکو کو آتے دیکھا جو اب ڈاکو کے کام سے چھٹکارا پا چکا تھا جسے رانی اتفاق سے نانا کہتی تھی۔ رانی نے کہا تھا کہ نانا جی میں کل سے شہر جا رہی ہوں۔ مجھے دُعائیں دیں تاکہ میں اپنے کام میں کامیاب ہوسکوں اور کوئی جاننے کے لائق بات ہو تو بتائیں۔

بوڑھے ڈاکو نے کھانسنے کے بعد کہنا شروع کیا۔ سنو اس چمبل گھاٹی میں کئی ڈکیت آئے اور چلے گئے۔ پر چمبل ادھر سات آٹھ برسوں سے ہمارا سردار بنا ہوا ہے۔ ہم اس کے ماتحت ہیں اس لیے ہم مجبور ہیں۔ ہمارے کچھ ساتھی اس سے خوش ضرور ہوں مگر میں ناخوش اور سخت مخالف ہوں کیونکہ اس میں ایک بہت بری لت پڑی ہوئی ہے جسے ہمارے یہاں بہت خراب سمجھا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ اسے دوسروں کی بہو بیٹیوں کو چھیڑنے اور ان کی عزت لوٹ کر ان کی زندگی برباد کرنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ تم سے پہلے اس نے آٹھ معصوم اور بے گناہ لڑکیوں کی زندگی سے کھیلا ہے اور انھیں گولی کا نشانہ بنا کر موت کے گھاٹ اتار چکا ہے۔ اس لیے میں یہی کہنا

چاہوں گا کہ بیٹا تم اس بات سے ہوشیار رہنا ... ..کہتے کہتے اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دولڑیاں گر پڑیں۔ اس نے آنسوؤں کو خشک کر کے پھر کہنا شروع کیا ——— دیکھو بیٹا! جب تم نے مجھے نانا کہا ہے تو میرا فرض بن جاتا ہے کہ تمھیں اس درندے سے بچاؤں پر میں مجبور ہو چکا ہوں۔ لیکن میرے چند ساتھی بھی اس کے خلاف ہیں۔ رہی دعا کی بات تو میں گناہگار بندہ کیا دعا دے سکتا ہوں۔ اوپر والے نے چاہا تو تمھاری زندگی میں کبھی دُکھ نہ آئے اور تم ان مصیبتوں سے ہمیشہ آزاد رہو۔

لیکن اب تو یہ نازنین بہت کچھ بدل چکی تھی بلکہ چست و چالاک اور شجاعت کی ملکہ بن چکی تھی۔ بڑے بڑے بینکوں اور مال گوداموں کا آسانی سے کام کر جاتی تھی۔ چمبل سے زیادہ لوگ چمبل کی نویں رانی کے نام سے دہشت اور خوف کھاتے تھے۔ یہاں تک کہ جب وہ فوجی لباس پہنے گھوڑے پر چھلانگ لگاتی تو چمبل کے ساتھی بھی سہم جاتے تھے۔ اسے یہ واقعہ ہمیشہ یاد رہے گا جب اسے دائیں پہلو کے نزدیک گولی لگی تھی۔ چمبل نے جلدی سے اُسے گھوڑے پر لادا تھا اور وہاں سے نو دو گیارہ ہو گیا تھا۔ وہ علاج کے بعد جلد ہی صحت یاب ہوگئی تھی۔ اس کے بعد تو وہ اور بھی ظالم اور دہشت ناک ہوگئی تھی۔

چمبل کے اب تک نہ آنے سے اس کی پریشانی اور بڑھ رہی تھی۔ وہ سوچنے لگی آخر آج کون سا حادثہ درپیش آیا کہ اس نے مجھے بھی ساتھ نہیں لیا اور یہ پہلی بار ایسی بات ہوئی ہے کہ اب تک وہ شہر سے نہیں لوٹا ہے۔

اتنے میں ڈاکوؤں کی ٹولی آتی ہوئی دکھائی دی۔ جب یہ ٹولی سامنے آئی تو چمبل نظر نہیں آیا۔ اسے یہ سمجھتے دیر نہ لگی کہ چمبل مال چھپانے گیا ہوگا۔ اس خیال کے آتے ہی وہ اسی حالت میں دوڑتی ہوئی غار کے نزدیک پہنچی۔ لیکن یہ کیا۔ اسے تو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ کسی لڑکی کی چیخ چلاہٹ سن کر وہ کھڑی ہوگئی۔ اس نے دیکھا

منگل کسی نازک سی لڑکی کو اپنے پہلوؤں میں جکڑے زبردستی اس کے کومل جسم کو نوچ رہا تھا اور اب معصوم لڑکی کا جسم نیم عریاں ہو چکا تھا۔ اتنے میں رانی کے دماغ پر اس بوڑھے ڈاکو کی بات تیزی سے رقص کرگئی۔ وہ آہستہ سے بڑبڑائی، ''اچھا تو یہ ہوگی چمبل کی دسویں رانی۔'' دوسرے ہی لمحہ اس کی نظر بندوق کے گھوڑے پر تھی۔ جونہی گھوڑا دبایا گولی کی آواز سنسان پہاڑوں کی فضا میں گونج گئی۔ مجبور و بے بس لڑکی آنکھ پھاڑ پھاڑ کر اپنی خوف زدہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی ـــــــ ادھر چمبل کے سینے میں گولی پیوست ہو چکی تھی۔ جب رانی غار سے اس لڑکی کو نکال کر آگے بڑھی تو چمبل کے سارے ساتھیوں کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں.....!

۱۵

خودکشی کا سوال

انسپکٹر امجد خاں کسی دفتری کام سے باندرہ سے پونا جارہا تھا۔ وہ اپنی بائیک پر سوار، بادِ مخالف کا سینہ چیرتا چلا جارہا تھا۔ دفعتاً اس نے پُل پر موٹر سائیکل کی رفتار دھیمی کردی پھر کچھ آگے چل کر روک دی۔

"کیا بات ہے؟ روکنے کے لیے ہاتھ کیوں دکھایا تم نے۔" انسپکٹر امجد خاں نے بوسیدہ چادر اور دھوتی میں ملبوس اس اپاہج شخص سے دریافت کیا جو دور ہی سے گاڑی روکنے کے لیے ہاتھ دکھا چکا تھا۔

"بابو جی! جلدی سے اس پل کے نیچے دیکھئے، ابھی ابھی ایک عورت اس دریا میں کود گئی ہے۔"

اس نے گھبراتے ہوئے جیسے ہی اپنا جملہ پورا کیا امجد خاں فوراً وہاں پہنچا لیکن اس جلدی کے باوجود بھی اس کی ساڑی کے ڈوبتے ہوئے آنچل کے سوا کچھ بھی نہ دیکھ سکا۔ اب وہ کیسے یقین کرلیتا کہ کسی دوشیزہ نے خودکشی ہی کی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی سازش ہو۔ ذہین امجد خاں نے ماحول کا جائزہ لینا شروع کردیا۔ اس شخص پر تو

شبہ کرنا ہی بیکار تھا کیونکہ وہ بے چارہ اپاہج تھا۔ یکا یک اس کی نگاہ قلم کے بار سے دبے ہوا میں لرزتے پھڑپھڑاتے ہوئے کاغذ پر پڑی۔ وہ جلدی جلدی اس کاغذ میں درج تحریر کو پڑھنے لگا۔

''آج سے بیس سال قبل جدّن کے یہاں بچہ پیدا ہوا۔ اس نے اس کا نام بڑی چاؤ سے امیرن رکھا اور بیٹی کا ایک لباس زیبِ تن کر دیا۔ ذرا بڑی ہوئی تو اس کا باپ کہلوانے والا کوئی نہ تھا اور سہیلیوں نے اس کو حرامی کا لباس پہنایا۔ ہوش سنبھالنے تک اس کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس نے اسے بہن کا لباس زیب تن کر دیا۔ وہ علم کی بڑی شوقین تھی جیسے تیسے تعلیم حاصل کر رہی تھی کہ گاؤں کے آواروں نے اسے جانِ من کا لباس پہنانا شروع کیا۔ تب ایک نابینا سے اس کی شادی کر دی گئی۔ وہ اسے ماں سے جدا کر کے پونا شہر لے آیا۔ پھر اس نے بیوی کا ایک خوبصورت سا لباس زیب تن کرا دیا۔ اب وہ شہر سے دور جھونپڑ پٹی کے کوچوں میں زندگی کے بقیہ دن کاٹنے لگی تھی اور لوگوں نے اسے بھکارن کا لباس پہنا دیا تھا۔

آپ سوچیں گے آگے چل کر آج کل جو ہر نوجوان لڑکی کے ساتھ ہو رہا ہے وہی ہوا ہوگا لیکن نہیں ——— میرے ساتھ وہ سب نہیں ہوا (حالانکہ وہاں بھی چھوٹے بڑے ہر طرح کے کوٹھوں کی کٹنیاں آتی رہتی تھیں) چونکہ میں حسین و جمیل جو نہ تھی میں تو بدصورت سیاہ فام خاتون تھی۔ اس لیے سماج نے مجھے اس بلند مرتبہ کوٹھے پر نہ بٹھایا جہاں سے مجھے سماج کا گرا ہوا فرد بھی تصور کر لیا جاتا۔ یعنی طوائف کا لباس عطا کیا جاتا ———

وقت کا کارواں رواں دواں تھا۔ لوگ ابھی نیم پاگل کا لباس ٹھیک سے پہنا بھی نہ سکے تھے کہ بچوں نے اس پر پتھر پھینک کر منھ چڑھا کر اس کا استقبال کرنا شروع کر دیا کیونکہ اب وہ مکمل پاگل پن کا لباس زیب تن کر چکی تھی۔ وہ کبھی

نہ سمجھ سکی کہ اس کا قصور کیا ہے۔ اس کی زندگی میں ایک رات ایسی بھی آئی جو اپنے سیاہ دامن میں نحوست سمیٹے ہوئے تھی۔ اس تاریک شب میں جھونپڑ پٹی کے ہوس پرست گنگا کو اس کے گھر کا راستہ صاف نظر آیا۔ وہ شراب کے نشہ میں دُھت لڑکھڑاتا ہوا آیا اور گوشت کے بھوکے بھیڑیے کی طرح شکار کے اوپر ٹوٹ پڑا۔ دوسری صبح وہ اس قابل نہ رہی کہ زمانہ کو اپنا منھ دکھا سکتی ــــــ آج کی امیرن نے سوچا کل وہ کسی امیرن کو جنم ہونے نہیں دے گی اور امیرن یعنی میں نے خودکشی کر لی۔

لیکن سوال یہ ہے کہ مجھ جیسی ابھاگن کو کب تک خودکشی کرنے پر مجبور ہونا پڑے گا؟ کب ہمارا سماج جاگے گا؟ کیا آپ نے کبھی یہ سوچا ہے؟

١٦

بنجارن کا پیار عجب

موسم گرما کی اندھیری رات تھی۔ نصف رات گزر چکی تھی، سنی بیٹھا اپنے کمرے میں پڑھ رہا تھا کہ اچانک اس کے باغیچے کے کنویں میں کسی بھاری چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ وہ چونک گیا، ہونہ ہو کوئی چور ہے۔ اس نے سوچا، ایسا سوچنا فطری بھی تھا کیوں کہ اس زمانے میں اس کے قصبے میں چوری کی متواتر کئی وارداتیں ہو چکی تھیں۔ وہ دبے پاؤں چھپتے چھپتے کنواں کے نزدیک پہنچ گیا۔ تبھی اسے کنویں کے پاس کسی شخص کے کھڑے ہونے کا احساس ہوا۔ دفعتاً اس کا ہاتھ کمر میں رکھے ریوالور کی طرف چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سامنے کھڑے سائے پر ٹارچ کی روشنی پھینکی۔ لیکن یہ کیا؟ وہ ایک دم حیرت زدہ رہ گیا۔ کنویں کے پاس ایک دوشیزہ کھڑی پانی بھر رہی تھی۔ روشنی پڑتے ہی اس نے سنی کی طرف یکلخت مڑ کر دیکھا۔ چہرے پہ عجیب ملے جلے جذبات کے رنگ ابھرے اور ڈوب گئے تھے۔

''تم کون ہو؟'' سنی نے اس کی جادو اثر آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہوئے دریافت کیا۔

''بنجارن!'' جل ترنگ کی پر جوش آواز فضا میں ابھر کر ڈوب گئی۔ سنی نے اس کے ابھرے ہوئے دلکش ہونٹوں پہ نظریں جما کر پوچھا۔

''کہاں رہتی ہو؟''

''کہیں بھی ......'' اس نے آنکھیں مٹکا کے جواب دیا۔

''یہ کیا پہیلی ہے؟ خیر اتنے رات گئے اس وقت پانی کیوں بھر رہی ہو؟''

''میرے پتا کو تیز بخار آگیا ہے۔ بار بار پیاس لگ رہی ہے۔ میری جھونپڑی میں جو بھی پانی تھا ختم ہوگیا لیکن پیاس ہے کہ اب بھی نہیں بجھ رہی ہے۔''

''لیکن اس اندھیری رات میں، اس طرح .... بغیر کسی لالٹین یا بتی کے .... تمھیں کیا ڈر نہیں لگتا؟''

''ڈر کاہے کا بابو! ہم غریبوں کے پاس کون سی دولت پڑی ہے جو کوئی چھینے گا یا چرائے گا۔''

''ہے۔''

اس کی آواز کے اتار چڑھاؤ میں سنی کو نا جانے کیوں اس کے سینے میں دھڑکتے ہوئے دل کی غنائیت محسوس ہوئی۔ پھر بنجارن نے معصومیت سے پوچھا۔

''میں سمجھی نہیں؟''

''کیا کروگی سمجھ کر، چلو تمھیں تمھارے گھر تک چھوڑ آؤں۔''

''نہیں بابو۔ تکلیف کیوں کروگے، میں خود چلی جاؤں گی۔ ہمیں اندھیرے میں چلنے کی عادت سی ہوگئی ہے۔'' اتنا کہہ کر اس نے مٹکے کو اپنے تانبے کی طرح سرخی مائل کولھے پر رکھا اور اس پر ایک نگاہِ قاتلانہ ڈال کر آگے بڑھنے لگی۔ ابھی وہ چند ہی قدم بڑھی تھی کہ سنی نے بے چینی سے پکارا۔

''سنو!''

''کیا ہے بابو؟'' اس کے بڑھتے قدم رک گئے۔

"تمھارا نام کیا ہے؟" سنی نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"چاند۔" اس نے آخری بار سنی کو معنی خیز اور شوخ نگاہوں سے دیکھا اور پھر ٹارچ کی روشنی کے دائرے میں چلتے چلتے ایک تین چار فٹ اونچی جھونپڑی میں جاکر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ سنی حیرت سے ان بے ترتیبی سے بنی جھونپڑیوں کو دیکھنے میں محو تھا کہ یکا یک راموکاکا نے اس پر طاری سکوت کو توڑا۔

"چھوٹے صاحب، اب گھر چلیے۔"

"ارے راموکاکا تم؟" سنی نے حیرت سے کہا۔

"ہاں! چھوٹے صاحب، آپ کو ادھر آتے دیکھا تو میں بھی چوکنا ہوگیا لیکن یہ تو بے چارے بنجارے ہیں۔" راموجو سنی کے گھر کا پرانا نوکر تھا۔ اس نے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا، "پچھلے دفعہ بھی یہ سب آئے تھے تو تم نہیں تھے، بڑے صاحب سے اجازت لے کر ان لوگوں نے یہاں جھونپڑیاں بنالی تھیں۔ اس بار بھی یہ دو تین ہفتہ سے زیادہ نہیں ٹھہریں گے۔"

سنی اس رات دیر تک اس بنجارن کے بارے میں سوچتا رہا، اس کی لمبی لمبی پلکیں، بھرے بھرے گال، اور ابھرے ہوئے رسیلے ہونٹ دیر تک اس کے بھکے بھکے خیالوں کے مرکز بنے رہے۔ اس کے عضو عضو سے شگفتگی جھلک رہی تھی۔ اس نے سوچا یقیناً فطرت نے اپنے ہاتھوں سے اس کے اندر تازگی اور گدازیت بھر دی ہے۔

دوسری صبح دن چڑھے سنی کی آنکھ کھلی تو لال چاند کا پتہ نہ تھا۔ وہ بالکونی میں بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا لیکن بار بار اس کی نگاہیں ان جھونپڑیوں میں کچھ ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک ہار کر واپس آجاتی تھیں۔ جھونپڑیوں کے نزدیک کھونٹے سے خچر بندھے گھاس چر رہے تھے۔ صرف ایک جھونپڑی کے نزدیک سرخ گھوڑا بندھا کھڑا تھا۔ مختلف بنجارے اور بنجارن دھوپ کی تاب نہ لاکر جھونپڑیوں کے سائے میں نیم ملبوس یا نیم عریاں پڑے اپنے پھٹے میں مست نظر آرہے تھے لیکن نگاہیں جسے دیکھنے کے لیے بے تاب تھیں، اس

کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ سوچنے لگا، رات کا واقعہ کہیں خواب تو نہیں تھا—— لیکن دوسرے ہی لمحہ اس نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا، بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

انتظار کرتے کرتے سہ پہر ہو گئی۔ یکا یک اسے لان سے لگے پھولوں میں پژ مردگی کا احساس ہونے لگا۔ وہ بالکونی سے اتر کر لان میں چلا آیا اور پھر دیر تک ان پھولوں اور بیل بوٹوں کے مشاہدے میں محو رہا۔ اچانک اس کی نگاہ اٹھی تو اس کے دل کا کنول فرط مسرت سے کھل اٹھا۔ وہ بنجارن نہ جانے کب سے اس سرخ گھوڑے کے سامنے والی جھونپڑی کے قریب کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ نگاہیں ملتے ہی وہ چند لمحوں تک مسکراتی رہی۔ پھر ایک دم دوڑ کر جھونپڑی میں داخل ہو گئی۔ سنی کو کچھ سمجھ میں نہیں آیا لیکن جلد ہی وہ ایک پرزہ اور دوائیاں ہاتھ میں لئے بھاگتی ہوئی آئی اور بولی۔

"بابو! او بابو! تم میرا ایک کام کر دو گے؟"

"کیا بات ہے؟" سنی نے قطعی سنجیدگی سے پوچھا۔

"دیکھو نا اس پرچی میں ڈاکٹر نے کس طرح دوا کھلانے کو لکھا ہے؟" اس نے دوا اور پرچی سنی کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے مزید کہا، "میں تو ہڑ بڑی میں بالکل بھول ہی گئی۔"

سنی نے نسخہ پڑھنے کے بعد دوا کھلانے کے طریقے کو سمجھاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا جو عجیب انداز سے چمک رہی تھیں۔ دم بھر کو اس کے تبسم زیر لبوں کے اندر سے موتیوں جیسے دانت نظر آئے۔ وہ شکریہ ادا کر کے چلی گئی اور وہ دیر تک اس کے بل کھاتے ہوئے جاندار بالوں کو دیکھتا رہ گیا۔

یہ نیم وحشی بنجارے زندگی کی توانائیوں سے بھرپور، کتنی سچی زندگی جیتے ہیں۔ یہ زندگی کا اصل لطف اٹھاتے ہیں، ان کی رگوں میں زندگی کا سرور دوڑ رہا ہے۔ یہ بنجارے اندر سے کتنے ٹھوس اور خالص ہیں اس کا اندازہ آج کا مادوں کے انبار میں گھرا مہذب انسان نہیں لگا سکتا۔ مادی آسائش کی حصولیابی ممکن ہے مگر سچا سکھ

کسے حاصل ہے؟ شراب اور غازہ ہمیں وہ شادابی نہیں بخش سکتے ہیں جو شہد کی مٹھاس اور شبنم کی ٹھنڈک میں ہے۔

شام کے وقت سنی ٹہلتا ہوا اس کی جھونپڑی تک پہنچ گیا۔ تب تک چاند کے باپ کی طبیعت سنبھل چکی تھی۔ اس نے اپنے باپ سے سنی کا تعارف کرایا۔ تو اس نے بتایا وہ انگریزی دواؤں میں یقین نہیں رکھتا۔ اس کے پاس اپنی جڑی بوٹیاں ہیں مگر وہ اپنی چہیتی بٹیا کی ضد سے مجبور ہو گیا تھا۔

سنی کے دل میں ایک سوال بہت دیر سے مچل رہا تھا۔ وہ موقع و محل کی تلاش میں تھا اور اب موقع ملتے ہی اس نے فوراً پوچھ لیا۔

''دنیا اتنی ترقی کر چکی ہے لیکن آج بھی آپ لوگ خانہ بدوشی کی زندگی کیوں گزار رہے ہیں؟ کیا آپ کو پچیس منزلہ اور تیس منزلہ عمارتوں میں کروڑوں انسانوں کی طرح ایک جگہ رہنا پسند نہیں، جہاں آرام و آسائش کا ہر سامان مہیا ہوتا ہے؟''

''بابو جی! اللہ کی بنائی ہوئی زمین بہت بڑی ہے۔ ہمیں تو اس دھرتی کے دوسرے جانوروں سے سبق لینا چاہیے۔ آزادی جاندار کی فطرت ہے۔ ہم جہاں رہتے ہیں وہیں ہمارا گھر ہے۔ ہمیں مر کر اس مٹی میں جانا ہے جہاں کوئی بھی یہ عمارت اور یہ آرام و آسائش کے سامان نہیں لے جائے گا۔ خالی ہاتھ آیا ہے خالی ہاتھ جانا پڑے گا۔ پھر انھیں جمع کر کے کیا فائدہ؟ پھر یہ کہ قدرت کی دھوپ، ہوا اور پانی میں جو مزہ ہے وہ مشین سے حاصل ہونے والی چیزوں میں نہیں۔ ہم بنجاروں کو کسی کی پرواہ نہیں ہوتی۔ ہم جاڑے کی دھوپ میں مٹی پر ننگے سو جاتے ہیں۔ گرمی کی راتوں میں کھلے میدانوں میں ننگے پڑے رہتے ہیں اور ساون کی جھڑی ہماری طبیعت خراب نہیں کرتی، ہماری زندگی میں اطمینان ہے۔''

جب تک وہ بوڑھا شخص بولتا رہا دونوں کی نگاہیں اس چولہے کی طرف جمی ہوئی تھیں جو زمین میں گڈھا کھود کر بنایا گیا تھا۔ جہاں چاند بیٹھی گرم گرم لٹیاں سینک

رہی تھی جن کی خوشبو ان کے نتھنوں تک پہنچ رہی تھی۔

رات ہوئی۔ سنی حسب معمول سو چکا تھا۔ ٹھیک آدھی رات کو اس کی نیند اچانک اچٹ گئی۔ اسے لگا جیسے کوئی اسے بلا رہا ہے۔ غیر ارادی طور پر اس کے قدم باغیچہ کی طرف بڑھنے لگے۔ اس نے دیکھا کنوئیں کی منڈیر پر چاند بیٹھی کسی کا انتظار کر رہی تھی۔

"چاند!" سنی نے آہستگی سے پکارا۔

"بابو! بابو! تم آ گئے۔"

"لیکن تم یہاں ..... آج پھر ..... کیا کر رہی ہو؟"

"بابو، سچ بتاؤں جب سے تم نے میرا نام پوچھا ہے نا جانے مجھے کیا ہو گیا ہے میری آنکھوں میں نیند نہیں ہے۔"

"حقیقت تو یہ ہے چاند کہ مجھے بھی کچھ ہو گیا ہے۔ بار بار مجھے نہ جانے کیوں لگتا ہے کہ کوئی پکار رہا ہے۔ مہینے کے آخری دنوں کے چاند کی دھندلی روشنی میں سنی نے اپنے کانپتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اس کے چہرے کو تھام کر ان سحر آگیں آنکھوں میں جوں ہی جھانکا، وہ ساری دنیا بھول سا گیا۔ تھوڑی دیر کی ریشمی سرسراہٹ کے بعد چاند بادل کی بانہوں سے شرماتا ہوا نکلا اور چہرہ دمک اٹھا۔

اس کے بعد تو ان کا معمول بن گیا۔ ہر شب، رات کے کسی پہر چاند نکلتا، اپنی دودھیا روشنی بکھیر کر چکور کو دیوانہ بنا دیتا، رات کی زلف دیر تک گل شب بو کی اٹکھیلیوں سے پریشان ہوتی رہتی، اس طرح رات کی آخری پہر تک بادل اور چاند میں آنکھ مچولی ہوتی رہتی، شب نم ہوتی رہتی بوند بوند اور ہر بار بادلوں کے لمس سے چاند کا چہرہ دمک اٹھتا، چاند کے گھٹنے بڑھنے کے ساتھ محبت کی منزلیں طے ہوتی رہیں۔

ایک دن اچانک سنی کو اپنے جنگلات کی ڈاک کے سلسلے میں ایک ہفتہ کے لیے اسے چھوڑ کر کے قصبے سے باہر جانا پڑ گیا۔ اسے اتنا بھی وقت نہیں ملا کہ وہ چاند سے

کچھ کہہ سکے۔ شاید اس نے یہی سوچا تھا کہ وہ ایک ہی دن میں واپس آجائے گا، لیکن کسی طرح ایک ہفتہ کے بعد جب اسے فرصت ملی تو وہ سیدھا بھاگتا ہوا چاند کے پاس گیا، لیکن وہ بنجارے تو بہت پہلے ہی اس مقام کو چھوڑ کر اپنی اگلی منزل کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ سنی نے رامو کاکا سے دریافت کیا، اپنے طور سے تمام تلاش کیا۔ ان کا کوئی پتہ ٹھکانہ نہیں ملا تو مایوس ہو کر دن رات کمرے میں بند رہنے لگا۔ جب ٹھیک آدھی رات ادھر اور آدھی رات ادھر ہوتی تو وہ اسی باغیچے میں نکل جاتا اور پہروں اس کنویں کی منڈیر پر بیٹھا، چاند کو ٹک ٹک دیکھا کرتا، اس سے باتیں کرتا اور پھر صبح دم رامو کاکا اس کے پاس آجاتے اور سمجھا بجھا کر اسے گھر لے جاتے۔

"چھوٹے صاحب، صبح ہونے والی ہے اب تو گھر چلئے، آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔"

مگر اسے تو جیسے جنوں ہو گیا تھا۔ وہ ایک لفظ نہیں بولتا چپ چاپ اٹھ کر رامو کاکا کے ساتھ گھر چلا آتا۔ ہر وقت اس کے کانوں میں آواز آتی جیسے کوئی اسے پکار رہا ہو "بابو! بابو!" ٹھیک ایک ہفتہ کے بعد آٹھویں شب کو اسے لگا جیسے کسی نے اپنی انگلیوں سے اس کے ہونٹوں کو اچانک مسل دیا ہو۔ اس کی آنکھ کھل گئی، دیکھا تو اس کے سینے پہ چاند جھکی ہوئی بیٹھی تھی۔ مردانہ لباس میں ملبوس اسے شک ہوا لیکن جب اس نے اپنے منھ پر بندھے ہوئے ریشمی رومال کو ہٹایا تو سنی کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو نکل پڑے۔

"چاند! تم مجھ سے روٹھ کر کہاں چلی گئی تھیں۔" سنی گویا ہوا۔

"میں مجبور تھی، آج کتنے خطروں سے نکل کر تمھارے پاس آئی ہوں، اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔"

"مجھے اپنے پیار پر پورا بھروسہ تھا۔"

"بنجارن کا پیار جوالا مکھی ہوتا ہے، بابو!" اس نے سنی کے ساتھ چور دروازے

سے نکلتے ہوئے پُر وقار لہجے میں کہا، ''میں اپنی محبت کی خاطر اگر اپنی جان کی بازی لگا سکتی ہوں تو خون کا دریا بھی بہا سکتی ہوں، صرف تمھارا ساتھ چاہیے۔''

اس نے سنی کو گھوڑے پر سوار کیا اور آن واحد میں وہاں سے وہ دونوں روانہ ہوگئے۔ بھاگتے بھاگتے جب وہ بہت دور نکل گئے اور انھیں یہ یقین ہوگیا کہ خطرے سے باہر ہیں تو انھوں نے اطمینان کی سانس لی۔ جب آدھی رات گزر گئی تو تاروں سے جھلملاتے آسمان پر تیسرے ہفتے کا چاند چمک اٹھا۔ ان کا گزر پھول بن سے ہورہا تھا۔ چاندنی رات کی بھیگی ہوئی فضا میں جنگل کے پھولوں کی تیز خوشبو دلوں میں شدید ہیجان برپا کر رہی تھی۔ مہوئے کی نشیلی خوشبوؤں نے حواس کو مشتعل کرنا شروع کردیا تھا۔ ایسے موقعے پہ شاید وحشی شیرنی نسوانی جذبات پر قابو نہ رکھ سکی اور دیکھتے ہی دیکھتے محبت کے پے درپے جام نے دو جواں دلوں کو نشے میں شرابور کردیا۔

''چاند، تم کتنی حسین ہو''، سنی نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔

''بابو! آج تم نے میری محبت کو امر کردیا ہے۔'' ایک کرب کے ساتھ بنجارن نے یہ جملہ ادا کیا اور اس کے رخساروں پر آنسو بہہ نکلے۔

''دنیا کا سب سے زیادہ خوش نصیب مرد میں ہوں۔''

''دنیا کی سب سے زیادہ خوش نصیب عورت میں ہوں۔''

''کاش! یہ رات کبھی نہ ختم ہوتی۔'' دونوں نے ایک ساتھ کہا، ''کاش! یہ وقت یہیں ٹھہر جاتا۔''

دوسرے دن دوپہر سے پہلے وہ دونوں اس مقام پر پہنچ چکے تھے جہاں ان بنجاروں کی اگلی منزل تھی۔ جب وہ پہنچے تو چاند کے باپ نے زیادہ خوشی کا اظہار نہیں کیا لیکن اس کے ساتھ کے دوسرے بنجاروں کی صورتوں سے جو خفگی ظاہر ہورہی تھی اسے سنی نے بھانپ لیا۔

اس روز دونوں نے عمدہ ترین کھانا ایک ساتھ بیٹھ کر کھایا۔ کھانے کے بعد

شربت نوش کیا لیکن اس کے بعد سنی کے ساتھ کیا ہوا، کیا نہیں ہوا، اسے کچھ خبر نہیں، اس نے صرف اتنا سنا تھا کوئی سرگوشی کر رہا تھا۔

''ہم بنجاروں کو ان مہذب انسانوں پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔''

پھر کسی نے نیم خماری کی حالت میں اس سے چاند کو الگ کر دیا تھا۔ اس کے رونے کی سی آواز آئی تھی۔ مگر اس کے بعد پھر کیا ہوا، اس پر کیا بیتی اسے کچھ ہوش نہیں۔ جب ہوش آیا تو اس کی دُنیا اجڑ چکی تھی، وہ ایک ایک کو کبھی جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کبھی گڑگڑا گڑگڑا کر پوچھ رہا تھا۔

''بتاؤ، میری چاند کہاں ہے؟ تم لوگوں نے اسے کہاں چھپا رکھا ہے؟''

لیکن کسی نے اس کے متعلق نہیں بتایا۔ ان بنجاروں کی بستی سے وہ غائب تھی۔ پہلے تو اس نے صبر سے کام لیا کہ اگر وہ زندہ ہوگی تو پھر کسی نہ کسی طرح ضرور مل جائے گی۔ اس کی محبت میں وہ جوش تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت اسے روک نہیں سکتی تھی۔ لیکن جب دن پر دن بیت گئے، ہفتہ، مہینہ اور سال گزر گیا تو اس کی مایوسی بڑھتی چلی گئی وہ برسوں ان بنجاروں کے ساتھ منزل منزل دیوانہ وار گھومتا رہا لیکن اس کی چاند کا کوئی پتہ نہ چلا۔

اب سنی کو خیال آتا ہے کہ اس کے باپ نے شاید اسے گھوڑے سمیت جس پہاڑی علاقے سے وہ غائب ہوئی تھی وہاں کے کسی اندھے کنوئیں میں قید کر دیا تھا۔ جہاں اس نے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دی ہوگی۔ مگر اب اس واقعہ کو گزرے پچیس سال بیت چکے ہیں۔ سنی تب سے ہر رات دیوانوں کی طرح بیٹھا چاند کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا ہے۔ اس کے بال سفید ہو چکے ہیں۔ اس نے شادی نہیں کی، آج بھی چاندنی راتوں میں اسے کوئی اسی طرح پکارتا ہے ''بابو! بابو!'' اور وہ دیوانہ ہو اٹھتا ہے۔ جنون کی شدت سے گریباں پھاڑنے لگتا ہے اسے یقین ہے کہ اس کی چاند مری نہیں ہے بلکہ وہ اس سے ملنے ایک دن ضرور آئے گی۔

۱۷

جہیز کی آگ میں جلتی زندگی

پوس کی رات تھی۔ شب کے بارہ بجے مسافر پٹنہ کے لیے مغل سرائے سے ریل گاڑی کے ڈبے میں بیٹھے تھے۔ گاڑی پوری رفتار سے شب کی تاریکی کو چیرتی اور گرجتی ہوئی دوڑ رہی تھی۔

باہر دور دور پر کہیں کہیں روشنی دکھائی دے رہی تھی، لیکن ڈبے کے دروازے اور کھڑکیاں بند کردیے گئے تھے۔ اگلے چاروں ڈبوں میں آشا کی شادی کے باراتی کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ جیسے یہ ڈبے ان ہی کے لیے بُک کردیے گئے ہوں۔ تھکے ماندھے، وہ سب جہاں جگہ ملی، سو رہے تھے۔ بچے، جوان اور بوڑھے سبھی رنگ برنگے پوشاک میں ملبوس تھے۔ ہر ڈبے میں جہیز کے سامان بھرے ہوئے تھے۔ آشا سرخ ریشمی جوڑے میں ملبوس تھی۔ زیورات کی چمک دمک سے اس کے حقیقی رنگ کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ سُرخ ہونٹ اور سیندور سے مانگ بھری ہوئی تھی۔ موٹی بوجھل پلکیں اور بڑی بڑی سی خوبصورت آنکھیں، دونوں ہاتھوں میں سرخ کانچ کی چوڑیاں اور مہندی کے عمیق سرخ رنگ بہت ہی دلکش لگ رہے تھے۔ جس کے سپنے

وہ نہ جانے کب سے سجاتی آئی تھی۔ وہ آج بے حد حسین لگ رہی تھی۔ اس کے گھونگھٹ کا ایک گوشہ دُولہا کے کرتے سے گانٹھ کے ذریعہ بندھا ہوا تھا جسے لوگ کہتے ہیں کہ اگر ایک بار کسی کے باندھ دیا جاتا ہے تو جیون بھر اسی کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔

لیکن ان سب کے باوجود اس کا دل خوش نہ تھا۔ اس لیے کہ اس کے والدین نے مجبوراً ایک کنجوس اور سوداگر کے گھر اس کی شادی کردی تھی۔ اس کے والد ریلوے کے دفتر میں ایک معمولی کلرک تھے۔ تنخواہ معمولی، آمدنی کا دوسرا کوئی راستہ نہ تھا۔ خاندان بڑا، خرچ زیادہ تھا۔ کئی بھائی بہن زیرِ تعلیم تھے۔ بڑے بھائی کالج میں، خود آشا کی تعلیم میٹرک سے آگے نہ بڑھ پائی تھی اور چھوٹے بھائی بہن بھی زیر تعلیم تھے۔ آشا کی اس شادی سے قبل اور بھی دو رشتے آئے تھے۔ دونوں ہر نقطہ نگاہ سے درست تھے لیکن محض جہیز کی مانگ سن کر اس کے والدین رشتہ منظور نہ کرسکے اور کفِ افسوس ملتے رہ گئے تھے۔ جب تیسری مرتبہ رشتہ کے لیے یہ لوگ آئے تھے تو والد نے اس کی ماں سے کہا۔ " شانتی تم کیوں نہیں سمجھتی ہو، اگر بار بار رشتہ ٹوٹتا رہا تو لوگ کہیں گے کہ لڑکی میں ضرور کوئی عیب ہے، ورنہ یہ تھوڑی سمجھیں گے کہ حقیقت کیا ہے اور پھر لڑکی ذات ہے، جتنی جلدی ہو چلا دینا چاہیے پرایا دھن جس کا ہے اس کے گھر جتنی جلدی پہنچ جائے اتنا اچھا ہوتا ہے۔

اس دن سے بڑے بھائی راکیش کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ وہ ایک پرائیویٹ فرم میں ملازمت کرنے لگے تھے۔ شادی کے سامان اکٹھا کیے جانے لگے تھے۔ گھر میں اس دن سے خرچ کم ہونے لگا، کپڑے کم سے کم بنتے تھے، والد کے جوتے پھٹتے تو اسی کو سِلا سِلا کر کئی دنوں تک کام چلانا پڑتا تھا۔ بھائی بے چارہ اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی لاکر والد کو دینے لگا تاکہ اس کے والدین کے سر پر پہاڑ کے مانند بوجھ جلدی ٹل جائے۔ رفتہ رفتہ جہیز کے سامان مہیا ہونے لگے۔ اس کے

سسرال والے ہمیشہ اس کے والد سے ملتے اور حالات کا جائزہ لیتے رہتے، جب کبھی یہ لوگ گھر پر آتے، ہر کسی کی پریشانی میں اضافہ ہو جاتا، دوڑ دھوپ کر کے عزت کی خاطر عمدہ کھانے اور مٹھائیوں کا انتظام کرنا پڑتا اور اس بات کا مکمل خیال رکھا جاتا کہ کہیں انھیں کسی چیز کی شکایت نہ کرنی پڑے۔

خدا خدا کر کے شادی کا دن بھی آ گیا۔ اس کے والد نے جس مصیبت سے قرض اُدھار کر کے رقم اکٹھا کی تھی، ان کا دل ہی جانتا تھا۔ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی، محلے ٹولے کے لوگ واہ واہ کرتے رہ گئے۔ لیکن اس کے پڑوسی کی بات اسے ناگن کی طرح ڈسنے لگی۔ وہ اس کے ہونے والے چچا سے کہہ رہا تھا، ”میں نے تو آج تک کسی کلرک کے یہاں اتنی دھوم دھام سے شادی ہوتے نہیں دیکھی ہے۔ کیونکہ ایک تو اس کی آمدنی بہت کم ہوتی ہے اوپر سے اتنے دان جہیز اور زیورات تو کسی کلرک کے بس کی بات نہیں ہے، مگر کیا کرتے بے چارے، اپنی ہی بیٹی تھی اس لیے کسی طرح بھی ہیر پھیر کر کے انتظام کر ہی لیا۔“

اس خیال کے ذہن میں آتے ہی اس کی سانسیں بے جان سی ہو گئیں کہ نا جانے کتنے لوگوں نے اس طرح کی کتنی باتیں کہی ہوں گی۔ جب اس کے والد کے کانوں میں یہ باتیں پڑی ہوں گی تو نہ جانے ان پر کیا بیتی ہوگی۔ رخصتی کے وقت اس کے سبھی بھائی بہن اس سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ والد کے یہ جملے اس کے ذہن میں اب بھی گشت کر رہے تھے۔ ”بیٹی میں کیا کر سکتا ہوں دنیا کا یہی رواج ہے، لڑکی تو دوسروں کی ہوتی ہے، میرا جو فرض تھا میں نے اُسے پورا کیا، بھگوان تمھیں اچھا رکھے۔ تم ہماری اور اپنی ماں کی لاج رکھنا۔ سسرال والوں کو شکایت کا موقع نہ دینا۔ ہر قدم پھونک کر بڑھانا، تجھے بھگوان کو سونپتا ہوں۔ وہی تیری رکشا کرے۔“ کہتے کہتے انھوں نے اُسے اپنے سینے سے لگا لیا تھا اور ان کے آنکھوں سے گنگا جاری تھا۔ ابھی تک اس کے ذہن میں سب نقشہ گھوم رہا تھا۔

ماں کے دانت پہ دانت لگ رہے تھے۔ انھیں ہوش آتا تھا پھر بے ہوش ہو جاتی تھیں۔ وہ ابھی ٹھیک سے رو بھی نہ پائی تھی کہ اپنے پیارے والدین اور معصوم بھائی بہنوں سے اس کی جدائی ہو گئی تھی۔

اتنے میں دور سے ریل گاڑی کے آہستہ آہستہ چلنے کی آواز آنے لگی، جو ایک مال گاڑی کی آواز تھی۔ اس میں مال سے بھرے بہت سے ڈبے تھے اور مال گاڑی دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔

شوہر پر نگاہ پڑتے ہی آشا کے بھوں تن گئے۔ اسے اپنا کھوسٹ شوہر ذرا بھی پسند نہ تھا۔ لیکن وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ اپنی قسمت کو رو رہی تھی اور اپنی اس شادی کا سب سے بڑا ذمہ دار جہیز کو ہی سمجھ رہی تھی۔ جہیز کے اس برے رسم پر اسے غصہ آرہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ ''اگر اس رواج کے چلانے والے کا پتہ چل جاتا تو اسے جا کر قتل کر دیتی اور خود پھانسی پر چڑھ کر لاکھوں، کروڑوں معصوم بہنوں کو جہیز جیسی مہلک مرض سے بچالیتی۔''

وہ سوچنے لگی۔ پرانے زمانے میں شادی بیاہ کے موقع پر لڑکی کو اس کے والدین اور رشتہ داروں کی جانب سے تحفہ اور بھینٹ دینے کا رواج تھا جو آج جہیز کہا جاتا ہے۔ پُرانے دور میں یہ چلائی گئی، تحفہ دینے کی رسم دھیرے دھیرے بدنما اور بھیانک شکل اختیار کر گئی ہے۔ آج اس تحفہ اور جہیز کے رواج میں آکاش اور پاتال کا فرق ہے۔ جہیز کا یہ چلن ہماری تہذیب و تمدن کا ایک گھناؤنا کلنک ہے۔ اس رواج کی وجہ سے شادی ایک تجارت بن گئی ہے۔ لڑکے کے والدین اپنے لڑکے کی صورت، ہنر اور تعلیم وغیرہ کے عوض مختلف رائے قائم کر لیتے ہیں اور من چاہی قیمت وصول کرتے ہیں۔ بھلے ہی لڑکی والے کے لیے کھانے کے لیے کچھ نہ ہو۔ کبھی کبھی تو لڑکی کی زندگی کو خوش دیکھنے کے لیے لوگ اپنی معاشی حالت سے بھی زیادہ خرچ کر کے داماد چن لیتے ہیں۔

شادی کا اُڈیش ہے ـــــــ داماد اور بہو کے مابین خوش گوار تعلق قائم ہونا تاکہ ان کے میل سے خوش حال خاندان بن سکے۔ آج برے رواج کے سبب اَن میل شادیاں ہونے لگی ہیں۔ جس کی سزا زیادہ تر لڑکیوں کو ہی بھگتنا پڑتی ہے۔ اسی وجہ سے سوشیل، خوبصورت اور ہنر مند لڑکیوں کا جیون نرک (جہنم) بن جاتا ہے۔ جہیز کی کمی کے سبب ہی ایسی لڑکیاں جاہل، بدکار اور بدکردار مردوں کے پلّے باندھ دی جاتی ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ زیادہ جہیز پانے کے لالچ سے لڑکے کے والدین اپنے نیک اور ہنرمند بیٹے کے لیے کرکشا اور کالی بہو لے آتے ہیں۔ وہاں بہو اور داماد دونوں کا جیون برباد ہوجاتا ہے۔

آشا کی سانسیں تیز تیز چلنے لگیں، دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور چہرہ غصہ سے لال ہوکر تمتما اٹھا۔ اس کا ذہن ایسے ہر شخص سے انتقام لینے کے لیے تلملا اٹھا۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگی، ”آج کل تو کچھ لوگوں نے جہیز لینے کا دھندا ہی بنا لیا ہے۔ کسی ایک لڑکی سے ویواہ کرکے زیادہ جہیز لیتے ہیں پھر اس لڑکی کو کسی طرح سے مار ڈالتے ہیں۔ اس کے بعد دوسری شادی کرکے دوسری بار جہیز وصول کرتے ہیں۔ اسی طرح کئی بار جہیز لینے کے لیے سرگرداں رہتے ہیں پر ہمارا سماج ایسے مجرموں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرتا.....

یکایک گھڑگھڑ، کڑکڑ اور دھڑام دھڑام کی آواز سنائی دی۔ اس سے لوگ کانپ اٹھے۔ اس سے پورے ڈبوں پر ایک جھٹکا سا لگا۔ اس ٹکراؤ کا سبب کانٹے والے کی بھول تھی، اس نے غلطی سے دونوں گاڑیوں کو ایک ہی پٹری پر کردیا تھا۔ دونوں گاڑیوں کے انجنوں کی ٹکر ہونے سے بہت زوردار اور دہشت ناک آواز پیدا ہوئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے زلزلہ سے زمین پھٹ رہی ہو۔ چند لمحے بعد چیخ و چلاہٹ اور ہائے ہائے کی دل ہلا دینے والی صدائیں کانوں میں گونج اٹھیں۔ آخری ڈبے پر تو اس کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا لیکن شروع کے کئی ڈبے اس سے بہت زیادہ متاثر ہوگئے۔

تاریک شب تھی۔ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ آخری ڈبے سے کچھ لوگ اتر کر نیچے آئے۔ اب دونوں گاڑیوں کے گارڈ، ہاتھوں میں ٹارچ لیے حادثاتی مقام پر پہنچ چکے تھے۔ سواری گاڑی کے اگلے چار ڈبے چکنا چور ہو چکے تھے۔ اس منظر کو دیکھ کر رواں رواں کانپ اُٹھا۔ بہت سے لوگ وہاں ٹارچ لیے آپہنچے تھے۔ انھوں نے بہت سے لوگوں کو زندہ نکال لیا لیکن کئی لاشیں بھی نکالی گئیں۔ جن کے چہرے بھیانک شکل اختیار کر چلے تھے۔ جو لوگ زندہ نکالے گئے تھے، وہ سبھی زخمی تھے۔ اس وقت کچھ لوگوں نے داناپور اور مغل سرائے کو فون کر کے جائے حادثہ کی خبر دی۔ فوراً ہی دونوں مقاموں سے فوری علاج کے لیے لوگ آپہنچے۔ جلد ہی گھایلوں کی مرہم پٹی شروع کردی گئی۔ دونوں گاڑیوں کے انجن بے کار ہو گئے تھے۔ مگر اتفاق سے دونوں کے ڈرائیور بچ گئے۔

لیکن خدا جس کی حفاظت کرے، اُسے مٹا سکتا ہے کون؟ آشا حادثہ سے محفوظ تھی۔ اس کے سبھی رشتہ دار جو ریل کے اگلے چار ڈبوں میں کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے، موت کے گھاٹ اتر چکے تھے۔ کچھ لوگ زندہ تھے مگر زخمی اور لاغر ہو چکے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کا دولہا بھی اس حادثہ سے بچ نہ سکا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ "چلو بھگوان کو جو منظور تھا وہی ہوا۔ شاید اُسے بھی یہ رشتہ منظور نہ تھا۔" یہ آشا کی تقدیر کا کمال تھا کہ بہ یک وقت دو دو حادثات سے بال بال بچ گئی اور ہمیشہ کے لیے اس سے آزاد ہوگئی۔ ورنہ آج وہ اس وزنی ڈبے تلے سوئی ہوتی یا نہیں تو پھر جہنم کی اس آگ میں جل رہی ہوتی جہاں سے نکلنا کبھی ممکن نہیں ہوتا۔ اور اب اس نے کافی تردد کے بعد طے کرلیا کہ وہ دوبارہ اپنے والدین پر بوجھ نہیں بنے گی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے والدین اور بڑے بھائی نے کتنی محنت و مشقت سے اس کی شادی کی تھی اور جہیز کا سامان مہیا کیا تھا تاکہ ان کے سر پر سے بوجھ ٹل جائے۔ چنانچہ، اس نے دوبارہ گھر نہ جانے کا عزم کرلیا۔ واقعی اب تو اس کے والدین میں دوبارہ ہمت و صلاحیت بھی باقی نہ رہی تھی۔

آشا نے صبح ہوتے ہی والدین کے نام، اطلاع کے لیے ایک خط روانہ کردیا اور اپنی بچپن کی ہم مکتب شری لکشمی بائی، جو دتی کی سماجی خدمت میں مصروف ایک لائق رہنما تسلیم کی جاتی ہیں، کے یہاں روانہ ہوگئی۔

دتی جانے والی ریل پلیٹ فارم پر لگی ہوئی تھی۔ سیٹ پر بیٹھتے ہی اس کا سلسلۂ قیاس جاری ہوگیا۔ وہ خیالی پلاؤ بنانے لگی کہ دلی جاکر سب سے پہلے، وہ یہی بھاشن دے گی کہ ''دیج پرتھا'' کا روگ غیر تعلیم یافتہ لوگوں کی بہ نسبت تعلیم یافتہ لوگوں میں زیادہ پھیلا ہوا ہے۔ دیج پرتھا تو بنا ہاتھ پاؤں ہلائے دوسرے کا دھن ہڑپنے کا ذریعہ ہے۔ سماج سدھارک اور نیتاجی دہیج کے روگ کو دور کرنے کے لیے اُپدیش دیتے ہیں، لیکن مرض بڑھتا گیا، جوں جوں دوا کی۔ سرکار نے دیج پرتھا کے خلاف قانون تو بنادیا ہے۔ اس سے ہوتا کیا ہے؟ جب کوئی شکایت کرنے والا ہی نہیں تو قانون کیا کرے گا۔ بے چارہ لڑکی والا تو اپنی عزت کے ڈر سے شکایت نہیں کرتا، دیگر حضرات کو کیا غرض؟ اس پرتھا کو سماج کے نوجوان ہی ختم کرسکتے ہیں۔ اگر وہ تیار ہوجائیں تو ماتا پتا کچھ نہیں کرسکتے.....

☆☆☆

اس روز سے آج تک آشا کی کوئی خبر نہیں ملی۔ خاندان کے تمام افراد، عزیز و اقارب پریشان ہو اُٹھے۔ انھیں اپنے نئے داماد کی موت کا کوئی غم نہ تھا مگر اپنی عزت کے ڈر سے مرے جاتے تھے۔ کئی دنوں تک دفتر سے مسلسل ناغہ نے آشا کے والد کی اداسی میں اور اضافہ کردیا۔ ایک دن کسی خیال میں غرق، چوراہے سے گزر رہے تھے کہ ایک مال سے لدے یکہ کے نیچے آگئے۔ نوبت یہاں تک آپہنچی کہ ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ لے دے کے ایک بھائی کے سر پر، گھر کا پورا خرچ آٹھہرا۔ ان کے خاندان کے گلشن میں نحوست کی ایسی لہر دوڑ گئی کہ روز بروز مفلسی و غریبی کی خلیج مزید عمیق ہوتی چلی گئی۔

جب اس کی پیاری سہیلی لکشمی بائی کو خبر ہوئی تو انھوں نے بھی بذات خود حالات کا مناسب جائزہ لیا اور تمام زبانوں کے مشہور اخبارات میں ''تلاش گم شدہ'' کے عنوان سے اعلان شائع کروا دیا۔ دیگر تمام نشانات کے ساتھ وہ یہ تحریر کرانا بھی نہ بھولے کہ آشا کے داہنے ہاتھ میں اس کا نام ''آشا پاریکھ'' سُرمہ سے گدا ہوا ہے۔

جب تمام انتھک کد و کاوِش کے باوجود آشا کا کوئی پتہ نہ چلا، تب یہ لوگ صبر و قناعت کو گلے لگا کر حسب معمول اپنی روزمرہ کی زندگی میں مشغول ہو گئے۔ وقت کا کارواں اپنی منزل کی جانب تیز گام تھا۔ اسی دوران تیسرا برس گزر رہا تھا کہ کسی اخبار کے ایک کالم میں یہ تحریر نظر سے گزری۔ ''دنیا کا تیسرا سب سے بڑا اسمگلر 'ہانگ چیانگ ڈینی' کا ایک گروپ جو سات اشخاص پر مشتمل تھا، اس کے تین آدمیوں کو پولیس نے پکڑ لیا ہے مگر افسوس کہ چند ہی منٹ بعد ان تینوں کو ایک تیز رفتار ہیلی کوپٹر نے گولی سے مار گرایا۔ صرف ان کی لاش ہی مل سکی ہے۔''

ان میں سے ایک جو اپنے نام سے ہندوستانی معلوم ہوتی ہے، اس کی عمر تقریباً انیس بیس سال کے قریب ہوگی، اس کے داہنے ہاتھ میں ''آشا پاریکھ'' سُرمے سے گدا ہوا ہے۔ بقیہ دو لڑکیوں کی اب تک شناخت نہیں ہوسکی ہے۔ اس کے ماسوا چار لڑکیاں جو انھیں کے گروپ کی تھیں، فرار ہونے میں کامیاب ہوگئی ہیں۔ ایسا قیاس کیا جاتا ہے کہ اس ہیلی کوپٹر میں وہ لڑکیاں سفر کر رہی تھیں، جنھوں نے ان تینوں لڑکیوں کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنایا تھا۔ فی الحال ان کے پاس سے ایسی انجکشن برآمد ہوئی ہیں جن کے لگانے سے انسان پر جنون کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے، جلد کا رنگ سیاہ اور آنکھیں بالکل سُرخ ہوجاتی ہیں۔ مزید تلاش جاری ہے۔

۱۸

داسی تیرے چرنوں کی

منگل سنگھ، وہ مشہور ڈاکو جس سے دنیا کانپتی ہے، جسے دنیا کی کوئی طاقت اپنے راستے سے نہیں ہٹا سکی، جو آج تک اپنی من مانی کرتا آیا، جس کی زندگی کے صحرا میں کبھی خوشی و محبت کے پھول نہ کھل سکے، جس کی آنکھوں نے قتل و غارت گری کے ہولناک مناظر دیکھے، جس نے خون کی ہولی کھیلی، جس کے دل کے گلشن میں کبھی بہار نہ آسکی، جسے دنیا کو صرف نفرت کی نگاہ سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ وہ آج وجودِ زن کی بدولت راہ راست پر آگیا ہے۔

وہ اس گھاٹی کو چھوڑ کر، ڈکیتی، قتل و غارت گری کو چھوڑ کر، ایک دہقان کی زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ آج وہ یہاں سے دیہات جارہا ہے۔ چمپا اس کے ہمراہ ہے۔ آج نہ جانے کیوں اسے یہاں کی ہر چیز بے گانی سی لگ رہی ہے۔

جہاں اس نے اپنی زندگی کے کئی برس گزار دیے، آج اسے وہ شراب و کباب، بم و بارود، بندوقیں، ہتھیار ...... اور تو اور، خود اسے اپنے پیشے سے نفرت سی محسوس ہورہی ہے۔ وہ اس گھاٹی کی تلخ یادوں کو اپنے دل کے گلشن سے ہمیشہ کے لیے اکھاڑ

کر پھینک دینا چاہتا تھا۔ مگر، ان سب چیزوں کو اپنے سے جدا کرتے ہوئے اس کے دل کا پیمانہ جذبات سے لبریز ہوتا جارہا ہے۔ اور اس بار وہ اس دھیمی آواز کو اَن سنی نہ کرسکا، جو بہت دیر سے اس کے دل کے نہاں خانے میں کوئی چپکے سے کہہ رہا تھا کہ آخر، وہ اس گھاٹی کو کیوں چھوڑنا چاہتا ہے.....؟

دفعتاً اس کے ذہن کے پردے پر اس کی ماضی کی تصویریں یکے بعد دیگرے اُبھرنے لگیں.....وہ برسات کی ایک شام تھی، بھیگی ہوئی خنک سی شام.....منگل سنگھ دنیا و مافیہا سے بے نیاز، قدرت کے نظاروں سے لطف اندوز ہورہا تھا۔ اس کا گھوڑا ایک جانب گھاس چر رہا تھا۔ ہر طرف سبزہ پھیلا ہوا تھا۔ گہری اودی گھنگھور گھٹائیں ہر سمت چھا رہی تھیں۔ آوارہ بادل ہوا کے دوش پر لہراتے پھر رہے تھے۔ کچھ دیر قبل ہی دھواں دھار بارش ہوچکی تھی۔ ہلکی ہوا کے لطیف جھونکے دل کو موہ لینے کے لیے کافی تھے۔ ہر شے پر روپ، ہر چیز دُھلی دھلائی، صاف شفاف، دل میں کھبی جارہی تھی۔ دور دور تک نالے، تالاب سب بھرے ہوئے تھے۔ لہلہاتی ہوئی ہریالی، بل کھاتی ہوئی پانی کی لہریں، من کو موہ رہی تھیں.....

دل کی امنگیں لہلہانے لگی تھیں۔ ننھے منے پرندے اس شاخ سے اُس شاخ پر پھدکتے پھر رہے تھے۔ بلبلیں چہچہا رہی تھیں۔ کوئلیں کوک رہی تھیں، پپیہے، پیہو پیہو کر رہے تھے، یکا یک چمپا کی پازیب کی چھم چھم اور گھنگھروؤں کی جھنکار نے اسے چونکا دیا تھا۔ شوخ رنگ گھاگر، چولی کے اوپر چُنری اوڑھے ایک چنچل حسینہ اس کی موجودگی سے بے خبر آوارہ ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی چلی آرہی تھی.....وہ ٹھٹھک کر ایک دم رُک گئی .....اس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی.....

اوئی.....مشہور ڈاکو منگل سنگھ.....!

اس کے ذہن میں یہ خیال آتے ہی وہ اُلٹے پاؤں بھاگی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی تھی۔ اس وقت نہ جانے کیوں منگل کے دل

میں اس تھرکتی مچلتی جوانی کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لینے کی تڑپ پیدا ہوگئی تھی۔ اس کی تشنگی کی تڑپ مزید شدت اختیار کر گئی تھی۔ وہ اس کے حصول کے لیے دیوانہ وار دوڑا۔ لیکن چمپا گاؤں کی الہڑ دوشیزہ اس کے ہاتھ نہ لگی۔ وہ بہت دیر تک اسے تلاش کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہا تھا......

بالآخر، وہ ایک بلند ٹیلے پر چڑھ گیا اور چاروں سمت نگاہیں دوڑا کر دیکھتا رہا تھا۔ دور دور پر چھوٹے چھوٹے گاؤں اور بستیوں کی جھونپڑیاں اور مربع و مستطیل نما کھیت، سورج کی ڈوبتی ہوئی روشنی میں تجریدی آرٹ کا نمونہ معلوم ہو رہے تھے۔ اچانک اس کے اندر کے طاقتور اور نڈر ڈاکو نے اس کے وجود کو جھنجھوڑ دیا تھا۔ وہ شرم و ندامت سے گڑا جا رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں بڑبڑایا...... بزدل، بے وقوف، گاؤں کی کم سن لڑکی نے تمھیں اُلو بنا دیا، تمھیں شرم آنی چاہیے۔ اتنی بڑی کایا کس کام کی ہے؟ کڑیل نوجوان ہوتے ہوئے بھی تم نے مردوں کی ناک کٹوا دی ......چھی ......چھی ......چھی ......

وہ ڈاکو ......جس کے نام سے دنیا کانپتی ہے، اسے گاؤں کی ایک ادنیٰ سی چھوکری نے .....

اس دن سے اس کا دل اس حسینہ کے وصل کے لیے تڑپ اُٹھا تھا۔ اس نے عزم کر لیا تھا کہ اسے اپنا کر ہی دم لے گا ....

اب وہ موقعہ کی تاک میں رہنے لگا تھا۔ اس ٹیلے پر کھڑا وہ دور دور کے گاؤں کو دور بین سے دیکھ رہا تھا۔ آج آسمان بالکل صاف تھا۔ نیلے آسمان میں اجلے اجلے بادل روئی کے گالوں کی مانند اڑتے پھر رہے تھے۔ اور شام کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی ...... ننھے منے پرندے آکاش میں اڑتے پھر رہے تھے۔ اُسی وقت تین اچھلتی کودتی الہڑ لڑکیاں، جن میں چمپا بھی شامل تھی، صراحی اور گاگر لیے پنگھٹ پر آئی تھیں۔ وہ اس جانب دوڑا تھا۔ چمپا بھی اس روز سے ہوشیار تھی ہی۔ کوئی چارہ نہ پا کر اس نے پانی میں چھلانگ لگا دی....

جب وہ وہاں پہنچا تو ہکا بکا رہ گیا۔ دو لڑکیاں تھیں۔ اس نے ان سے دریافت کیا تھا، اور وہ اسی تذبذب میں تھیں کہ بتائیں یا نہیں، ٹھیک اسی وقت پانی میں کچھ بلبلے اُبھرے، پھر اس کا سر نظر آیا تھا۔ یہ دیکھتے ہی اس نے بھی پانی میں چھلانگ لگا دی تھی لیکن اس بار بھی اس نے منگل سنگھ کو پچھاڑ دیا تھا۔ وہ ابھی گردن بھر پانی ہی میں تھا کہ چمپا نکل کر فرار ہو چکی تھی ..... پشیمانی، ندامت، غصہ اور ناکامی کے ملے جلے جذبات اس کے چہرے پر نمایاں ہو رہے تھے۔

وقت کا کارواں رواں دواں تھا۔

ایک دن جب اسے چمپا کے چچازاد بھائی کی سگائی کا علم ہوا تبھی وہ اپنے پورے گروہ کے ساتھ وہاں پہنچ گیا تھا۔ اور اس نے ڈاکہ ڈالا تھا اور چمپا کو اُٹھا کر اپنے اڈے پر لے آیا تھا.....

جب چمپا کو ہوش آیا تو وہ ایک غار میں پڑی ہوئی تھی۔ جہاں سے ایک عجیب قسم کی بو آرہی تھی۔ وہ اس غار کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھور رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ دفعتاً وہاں منگل سنگھ آ پہنچا تھا۔ اب سب کچھ اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ وہ کہاں ہے؟ اس نے وحشی درندے کی طرح اس پر جھپٹنا چاہا تھا اور وہ اسے بڑی سے بڑی قسمیں دلا کر اس کے ناپاک ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کررہی تھی۔ مگر شاید اس کے بھگوان نے بھی اس وقت اپنے کانوں میں روئی ٹھونس رکھی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کی گڑگڑاہٹ اور فریادیں وہ نہیں سن رہا تھا۔ ادھر منگل ان سب قسموں سے بے اثر اسے اپنی مضبوط بانہوں میں بھرنے کی کوشش کررہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کا نازک جسم اب نیم عریاں ہو چکا تھا.....

دفعتاً اس پر ایک بجلی سی گر پڑی تھی۔ جب چمپا نے دانت بھینچ کر کہا تھا..... کمینے..... اگر تیری ہوس کی آگ اتنی تیز ہے تو، تو اپنی ماں، بہن سے کیوں نہیں اس ہوس کی آگ بجھا لیتا..... تجھے تیری اس ماں کی سوگند ہے جس نے تجھے نو ماہ تک

ڈھویا اور اپنی ممتا کے سائے میں رکھ کر آج اس لائق بنایا....

اس کے یہ الفاظ اس کے دل میں نشتر کی طرح پیوست ہو گئے تھے۔ کیونکہ نہ اس کے باپ کا پتہ تھا اور نہ اس کی ماں کی خبر تھی۔ نہ اس کا بھائی تھا اور نہ ہی اس کی کوئی بہن۔ اُسے تو لوگ بچپن میں نہ جانے کیوں ''حرامی'' اور ناجائز اولاد کہا کرتے تھے.....

اس وقت اس کا نشہ شیشے کی طرح ٹوٹ کر چور چور ہو گیا تھا۔ اسے یکا یک خاموش دیکھ کر، چمپا نے اس کے اندر کے غیرت مند آدمی کو بھانپ لیا تھا۔ پھر مزید اثر ڈالنے کی خاطر اس نے سب سے بہترین نسوانی ہتھیار کو اپنایا تھا۔ اور زار و قطار رونے کے بعد ہچکچاتے ہوئے کہا تھا....

منگل.....! میں جانتی ہوں انسان کی مجبوری، اگر اس کا ایک روپ برا ہوتا ہے تو دوسرا روپ اچھا بھی ضرور ہوتا ہے۔ مگر یہ جھوٹا سماج اس کی برائیوں کو بڑھاوا دیتا ہے اور.... جب وہ برا ہو جاتا ہے تو اسے برا کہتے نہیں تھکتا....

اور.... منگل کے تصوّر میں اس کا بچپن رقص کرنے لگا تھا۔ اسے لگا تھا جیسے چمپا اس کے ماضی کو جانتی ہے.... اس کی نگاہیں ڈبڈبا گئی تھیں اور وہ کہے جا رہی تھی.....

منگل.... تمھیں یہ جان کر بے حد تعجب ہوگا کہ اسی ماہ میری بھی سگائی ہونے والی ہے، ہمارے سسرال والوں کو یہ بات معلوم ہوگئی تو.... تم خوب اچھی طرح جانتے ہو کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا....؟ اس بار اس نے منگل سنگھ کی دُکھتی رگ پر اُنگلی رکھ دی تھی۔ کیونکہ منگل سنگھ کی ماں کے ساتھ اس ظالم سماج نے اسی طرح کا سلوک کیا تھا اور اس کے باپ نے اس سماج میں عزت برقرار رکھنے کے لیے، جس کی عمارت کی بنیاد کذب و ریا پر کھڑی تھی، اسے ایک اپاہج بڑھیا کے پاس پھینک دیا تھا۔ اور آج وہ سماج کے ہاتھوں اس انجام پر پہنچ گیا تھا۔ جب اس کا صبر و ضبط کا

پیمانہ لبریز ہوگیا تو۔ وہ گریہ نہ روک سکا تھا اور بے اختیار اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سمندر اُمڈ پڑا تھا۔ اس کے بعد وہ اس کے پاکیزہ بدن کو چھونے کی بھی جرأت نہ کرسکا تھا۔

دوسرے روز چمپا کو اس کے گاؤں کے قریب چھوڑ کر وہ دور سے دیکھتا رہا تھا۔ جب وہ اپنے مکان میں داخل ہوگئی تھی تب وہ غمزدہ دل، بوجھل قدم، سرخ آنکھیں اور نڈھال جسم لیے واپس لوٹ آیا تھا۔

لیکن .... یہ کیا ....؟، منگل اسے دوسرے ہی دن صبح سویرے اپنے اڈے پہ دیکھتے ہی حیران رہ گیا تھا۔ اور وہ بولا تھا ....تم نے .... یہ کیا کیا ....؟، کیا تمھیں میں وہاں اسی لیے چھوڑ آیا تھا کہ آج تم یہاں پھر آدھمکو؟

''جب وہ کچھ نہ بولی تو اس نے اس کی گداز بانہوں کو پکڑ کر جھنجھوڑ دیا .... بولتی کیوں نہیں ....؟ کیا بات ہے؟ کس لیے واپس آگئی ہو؟

چمپا نے اپنی آنکھیں مٹکاتے ہوئے ایک ادا سے اسے دیکھا تھا .... پھر بہت ساری ہمتِ گویائی جٹا کر بولی تھی .... میرے اچانک غائب ہوجانے سے میرے سسرال والوں نے آکر میری ماں سے بہت سارے اُلٹے سیدھے سوالات کرڈالے تھے۔ اور جب ان کی باتوں کا میری ماں نے کوئی جواب نہ دیا تو جو ان کے منھ میں آیا برا بھلا کہہ کر چلے گئے .... اس اچانک صدمہ کو میری بوڑھی ماں کا کمزور دل سہہ نہ سکا اور .... میری ماں نے اس جھوٹے سنسار کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چھٹکارہ پالیا ....

لیکن .... تمھیں .... پھر اس طرف آنے کی کیا ضرورت پڑ گئی ؟ چلو .... تمھاری سسرال کہاں ہے؟ منگل نے گرج کر کہا تھا ....

لے .... لے .... لیکن ....! چمپا کی اس ہچکچاہٹ اور منگل کی معنی خیز نظروں کا اشارہ پاتے ہی اس کے سارے آدمی وہاں سے ہٹ گئے تھے۔

چمپا پھر سرگوشی کے انداز میں بولی تھی .... وہ .... میرے ہونے والے پتی تو .... میرے .... یعنی .... میرا .... مطلب ہے اس بوڑھے کھوسٹ سے تو .... میرے ماں باپ کی غریبی نے میرا رشتہ جوڑ دیا تھا اور میں مجبور تھی ....

لیکن جس پتا جی نے یہ رشتہ طے کیا تھا، جن کی بات کا احترام کرتے ہوئے میں نے مجبوراً اقرار کرلیا تھا، وہ پتا جی بھی اب تو لاپتہ ہو چکے ہیں ....

کچھ دیر تک خاموشی کا پرندہ اپنے پنکھ پھیلائے کھڑا رہا۔ پھر .... منگل سنگھ افکار کے سمندر میں غوطہ لگا کر بولا تھا ....

اب .... کیا ارادہ ہے .... ؟ اور اس کی حیا کے بارے جھکی ہوئی پلکوں کو دیکھنے لگا تھا .... اس کے جذبات سے لبریز چہرے کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا ....

تب چمپا کے دل میں بھی ایک دم سے جذبات کا ایک جوالا مکھی پھوٹ پڑنے کے لیے بے قرار ہو اٹھا تھا۔ اس کے نرم سرخ رسیلے ہونٹوں سے انگارے سے برسنے لگے تھے .... اس کا چہرہ فرطِ حیا سے تمتما اٹھا تھا .... اور .... جب اس نے اپنے بے ہنگم سانسوں پر کسی حد تک قابو پالیا تو بڑی ناز و ادا سے بولی ....

"کیا .... آپ .... مجھے .... پسند .... کریں گے .... میں آپ کے چرنوں کی داسی بننا چاہتی ہوں۔"

اس نے جذبات کی رو میں بہتے ہوئے یہ الفاظ کہہ کر اپنا چاند سا مکھڑا منگل سنگھ کے مضبوط فولادی سینے میں چھپا لیا تھا۔ منگل سنگھ کو چمپا کے گداز جسم کی گرمی عجیب لذت بخش رہی تھی .... اس کے اندر کا انسان جاگ اٹھا تھا اور وہ فرطِ خوشی سے دیوانہ ہوکر بے اختیار اُسے اپنی بانہوں میں لیے کھڑا تھا۔ مارے خوشی کے اس کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

اس نے چمپا کا خوبصورت چہرہ اپنے ہاتھوں کے حلقے میں لے کر اس کی پیشانی پر سبک سا بوسہ ثبت کردیا .... یہ اس کے سوال کا خوشنما جواب اور محبت کا

حسین اقرار نامہ تھا۔

اس روز منگل سنگھ کے اڈے پر تمام رات جشن منایا گیا تھا۔ رقص و سرور کی محفل گرم رہی تھی۔ نقارے کی چوٹ اور گانے کی دُھن پر جوان جسم تھرکتے رہے تھے ..... اور چمپا نے بھی منگل سنگھ کے قدم سے قدم ملا کر تمام رات رقص کیا تھا .....

''اُف ..... فوہ ..... اب چلو گے بھی یا بیٹھے ہی رہو گے۔'' چمپا کی دلفریب آواز نے اس کے خیالات کا سلسلہ اچانک منقطع کر دیا .....

منگل سنگھ ایک مخصوص انداز سے اپنے آدمیوں کو سمجھانے کے بعد بولا .....

''اچھا تو ساتھیوں! اب میں اس گھاٹی کو چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اور تم میں سے دیال سنگھ کو تمھارا سردار بنا کر جا رہا ہوں۔''

لیکن ..... دیال سنگھ کے ساتھ ہی ساتھ بھی ڈاکوؤں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھنے کے بعد بیک وقت ایک زبان ہو کر کہا .....

''سرکار! ہم لوگ آپ کے بغیر یہاں رہ کر کیا کریں گے؟ آپ ہمیں بھی اپنے ساتھ ہی لے چلیں۔ ہمیں اس زندگی سے اب کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے۔ جہاں آپ رہیں گے وہیں ہم بھی رہیں گے اور محنت مزدوری کر کے حق حلال کی روٹی کھائیں گے۔''

سب ڈاکو ہاتھ باندھے ان دونوں کی جانب جھکے ہوئے کھڑے تھے ..... چمپا اور منگل ان کے سامنے اپنے اپنے سفید عربی نسل کے گھوڑوں پر نہایت پُر وقار انداز میں سوار تھے۔ اور چمپا کو ایسا لگ رہا تھا گویا وہ کسی ریاست کی ملکہ ہے اور یہ سب اس کی رعایا .....۔

۱۹

انوکھا انتقام

مسلسل دو شب و روز کی مسافت سے شنکر کھتوریا تھک کر چور ہو رہا تھا۔ اس نے ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا اور تیز تیز قدموں سے اپنی منزل کی جانب گامزن ہوگیا۔

شہر کے اونچے اونچے مکانات اس کا خاموشی سے استقبال کررہے تھے۔ وقت بے وقت پہرے داروں کی سیٹوں کی صدائیں فضا میں طاری خاموشی کا سینہ چیر رہی تھیں۔ اسے اس بات سے بے پناہ مسرت حاصل ہورہی تھی کہ وہ آج پورے چھ سال بعد ونود کی شادی کی خوش خبری سن کر اس کے یہاں جارہا ہے۔ کچھ دیر بعد شہر کی صاف ستھری سڑکوں کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ ونود اس شہر سے کچھ ہی دور ایک عالی شان حویلی میں رہتا تھا۔

تاریک شب میں یکایک کسی ننھی سی دو آنکھوں نے، جو روشن نظر آرہی تھیں اسے چونکا دیا۔ سڑک سے ایک کالی بلی گزر رہی تھی۔ وہ تعجب میں پڑگیا کہ اب تک رامو دھوبی کی بلی زندہ ہے اور اپنی پرانی عادت سے باز نہیں آئی ہے۔ لیکن دوسرے ہی لحظ وہ اس کی فطرت سمجھ کر اسے ٹال گیا۔ اور لاکھ کوشش کرنے کے باوجود بھی وہ

اس چوراہے سے اپنے قدم آگے نہ بڑھا سکا.... وہ خود بخود کانپ گیا، جیسے کسی نے اس کے کل وجود کو جھنجھوڑ دیا ہو.....!

اسی وقت اس کا ذہن حال کی قید سے بغاوت کر کے ماضی کی جانب فرار ہوگیا۔

جب وہ ـــــ نویں جماعت کا طالب علم تھا، اس بھری پوری دنیا میں اس کی بڑی بہن کے سوا اس کا کوئی دوسرا یار و مددگار نہ تھا۔ وہ دونوں بھائی بہن ایک مشہور شخص کے یہاں ہوش سنبھالے سے اب تک ملازمت کرتے آئے تھے۔ لیکن اس شخص کی پاک روح بھی ایک روز اس دارفانی سے داربقا کی جانب پرواز کر گئی۔ ایک ماں تھی وہ بھی مالکِ حقیقی کی طرف روانہ ہوگئی اور نالائق اکلوتے بیٹے کو اپنا وارث چھوڑ گئی۔ اکلوتا بیٹا ونود شہر کا آوارہ غنڈہ بدکار نوجوان تھا۔ شراب و کباب میں مست رہنے لگا۔ اور یہ شنکر کھتوریا، جو چند برسوں قبل گاؤں کا ایک معصوم شیام تھا۔ اگرچہ اسے ونود کی حرکتیں قطعی پسند نہ تھیں تاہم بے کسی و مجبوری کی حالت میں سب کچھ برداشت کرتے اور صورتِ حال کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ بدستور اس کے یہاں کام کرتے رہے تھے۔ اس کی کرتوت کا خیال آتے ہی اس کا دل رُندھ گیا اور وہ سوچنے لگا کہ اس کا ذہن اس منحوس رات کو کبھی بھولنا گوارہ نہیں کرے گا۔

وہ سالانہ امتحان کا زمانہ تھا۔ شب کے آخری پہر وہ اٹھ کر پڑھ رہا تھا۔ اچانک اسے ایک خوف ناک چیخ نے چونکا دیا تھا۔ اس کی نگاہ شکنتلا پر گئی تھی۔ لیکن وہ اپنے بستر پر موجود نہ تھی، اب وہ چیخ دھیرے دھیرے ہچکی میں منتقل ہوچکی تھی، بغل کے کمرہ سے کوئی شخص دروازہ کھولنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ شیام کو سمجھتے دیر نہ لگی، وہ باہر سے دروازہ پر دستک دیتا ہوا بولا تھا:

"ونود اگر تمھاری زندگی پیاری ہے تو دروازہ کھول دو، ورنہ انجام بہت برا ہوگا۔"

اسی دوران عقب کا دروازہ کھلا اور پھر بند ہوگیا۔ دوسرے ہی لمحہ تیزی سے ایک سایہ گیٹ کے باہر نکل رہا تھا۔ وہ اس کا تعاقب کرنے لگا۔ سایہ تیزی سے

گاؤں کے نشیب و فراز طے کرتا ہوا پہاڑی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ مشرقی افق سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ شیام ہانپتا ہوا، جو اس سایہ کے قریب پہنچا تو صرف اتنا ہی سن سکا تھا۔

"شیام میرا پیچھا مت کرو، اب میں تمھاری منھ دکھانے قابل بہن نہیں رہی۔"

پھر صبح کی پہلی کرن نے شکنتلا کا نورانی چہرہ دکھایا تھا جو پہاڑ سے گرنے کے بعد خون میں لت پت پڑا تھا۔ اس رات سے اب تک شیام اس گھر میں نہیں داخل ہوا۔ وہ دوسری ہی شب ممبئی کا رخ کر چکا تھا۔ اس نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنا اسم و فعل بھی بدل لیا تھا۔

ایک عرصہ بعد، وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ونود نے محض اس کی غریبی و مفلسی کا مزاق اڑایا ہے ـــــــ اس دن سے وہ جب بھی کسی غریب لڑکی کو دیکھتا اس کا ذہن اس قیاس میں غرق ہو جاتا کہ کہیں اس کے ساتھ بھی کسی امیر زادے درندے نے ظلم و ستم تو نہیں کیا ہے......؟؟؟ اسے ایسا محسوس ہونے لگتا گویا ساری دنیا میں ہم غریبوں کی بیٹیوں اور بہنوں پر ظلم و ستم کا زور بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اس کا دماغ ونود جیسے ہر شخص سے انتقال لینے کو اکسانے لگتا تھا۔

شنکر کتھوریا غصہ میں آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ اس کی موٹی موٹی رگوں میں خون کھولنے لگا۔ لیکن پھر وہ بہت خوش ہوا...... بہت خوش ہوا...... اتنا خوش کہ اس کے منھ سے غیر ارادی طور پر قہقہہ نکل کر فضا میں بلند ہو گیا۔ اس کے خوش ہونے کی وجہ محض یہ تھی کہ آج وہ اپنی پاک دامن ہمشیرہ کے قاتل ونود سے انتقام لینے جا رہا تھا۔ جسے وہ اپنی زندگی کا ماحصل قرار دیتا تھا اور اپنا اولین فرض سمجھتا تھا۔

چاروں طرف گھور کر دیکھنے کے بعد شنکر کتھوریا صحن کی دیوار پھاند کر حویلی کے اندر داخل ہو چکا تھا، دیواروں کا سہارا لیتا ہوا وہ بیڈ روم تک پہنچا۔ دو بھاری بھاری سانسوں کی مسلسل صدائیں سکوت توڑ رہی تھیں۔ اپنے کمرہ کو دیکھ کر جہاں وہ پڑھا کرتا

تھا، پرانی یادوں میں گم ہوگیا۔ لیکن وہ اب پہلا شیام نہیں بلکہ زمانہ کے ہاتھوں چھٹا ہوا ممبئ کا اسمگلر شنکر کتھوریا تھا، جس نے انتقام کے شعلے میں جل کر اپنے آپ کو بہت کٹھور بنالیا تھا...... ! اور اب وہ بغیر گھبراہٹ محسوس کیے کمرہ میں داخل ہوگیا۔

ہلکی نیلی روشنی میں ونود اور اس کی بیوی پر شباب زندگی کی گہری نیند میں غرق تھے۔ اس نے ونود کے چہرے پر ٹارچ کی تیز روشنی پھینکی، وہ بھونچکا سا رہ گیا لیکن دوسرے ہی لمحے سنبھل کر برق سی سرعت سے وہ اٹھا اور اس نے شنکر پر چھلانگ لگا دی۔ شنکر کتھوریا قلابازی کھاتا ہوا مین سوئچ کے پاس پہنچا اور فوراً پورا کمرہ تاریک ہوگیا۔ ساتھ ہی ایک گھونسے کے ساتھ زور دار چیخ نکل کر فضا میں دور تک پھیل گئی......!!! کچھ دیر کے مسلسل اٹھا پٹخ کے بعد گولی چلنے کی آواز آئی۔ اس نے چوکیداروں کو بیدار کردیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر ایک گولی کی آواز فضا میں گونجی اور دو سائے ایک دوسرے کو گھسیٹتے ہوئے صحن کی طرف نکل کر کچھ دور تک رینگتے ہوئے نظر آئے اور پھر شب کی سیاہی میں آنکھوں سے اوجھل ہوگئے۔ لیکن کسی میں ان کے تعاقب کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

صبح ہوتے ہی مقامی تھانے میں ایک مجمع لگا ہوا تھا کسی کی لاش خون میں رنگی چادر سے ڈھکی پڑی تھی۔ ہر فرد اسے دیکھنے کے لیے منتظر تھا۔ پولس کانسٹیبل نے چہرہ سے جوں ہی کپڑا ہٹایا ہجوم میں ایک بار پھر ونود کا نام بھنبھنانے لگا۔ لوگ باگ دل ہی دل بہت خوش تھے۔ ان کی نگاہیں چمکنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے بھیڑ ہرن ہوگئی۔

شنکر کتھوریا شہر سے بہت دور نکل چکا تھا ——— آج اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ معاشرے کے تمام غنڈوں و بدکاروں پر غالب آگیا ہو اور اب بہت جلد ہی ظلم وستم اور بدکاری صفحۂ ہستی سے ختم ہوجائے گی۔

۲۰

کام ہی روشنی

میں فجر کی نماز پڑھ کر اٹھا۔ میرے اندر سے آواز آئی ______

"آج بڑے غضب کی سردی ہے۔"

میں صحن کو عبور کر ٹن شیڈ میں داخل ہو گیا۔ جی کڑا کر کے سوئیٹر اتارا اور ورزش کرنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دل دھونکنی کی مانند دھڑکنے لگا۔ سانسیں تیز ہوگئیں .... پٹھوں، سینے اور بانہوں سے انگارے کی مانند گرمی نکلتی معلوم ہونے لگی۔ یہ عجیب لذت بخش تھی۔ ورزش کر چکنے کے بعد بھاگ کر صحن میں آنکلا۔ یہاں تمام سبزہ زار پہ شبنمی آبگینے منتشر تھے جو میرے ننگے پاؤں میں برفیلی کیفیت سی پیدا کر رہے تھے۔ اب میں کنویں کے نیم گرم پانی سے غسل کرنے لگا۔ تولیہ سے جسم خشک کرتے وقت میں نے دیکھا، گھڑی میں ساڑھے چھ بج چکے تھے۔

میں حسب معمول سورج طلوع ہونے سے قبل اپنی بالکونی پر جا کر طلوع خورشید کا منظر دیکھنے لگا۔ ساتھ ہی بھگوئے ہوئے چنے چبانے میں مشغول ہو گیا۔ آہستہ آہستہ مشرقی افق سے سورج نمایاں ہونے لگا گویا کسی نئی نویلی دلہن کا دستِ حنائی ہو!

مجھے تو اس وقت ایسا معلوم ہوتا، جیسے عروسِ سحر دھیرے دھیرے گھونگھٹ کے پٹ کھول رہی ہو!

جوں ہی میں نے آفتاب کے منظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اپنی نگاہ نشیب کی جانب کی ــــــ میں مبہوت رہ گیا۔ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

ایک نہایت ہی خوبصورت نازنین کھڑکی کے پٹ کھولے ادھر دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے کی رونق دیکھ کر چاند بھی شرما جائے۔ (میں نے سوچا) بڑی بڑی جھیل سی خوبصورت آنکھیں پل بھر کو میری نگاہ سے ٹکرا گئیں..... نظروں پر پلکوں کی چلمن گری۔ پھر دو مرمریں ہاتھ بڑھے، کھڑکی کے پٹ بند ہوگئے۔ دفعتاً میرا طلسم ٹوٹا، میں چونک گیا۔ میرے دل نے کہا، مجھ کو اس طرح کھڑکی کی جانب نہیں دیکھنا چاہیے تھا۔ شاید یہ حسنِ سراپا شاہد کی خالہ زاد بہن ہوگی جو پرسوں شام کو اپنے گاؤں سے آئی ہے۔ اور میں کچھ سوچتے ہوئے کہ کتنی بھی حور ہے تو کیا ہوا میری نغمہ سے بڑھ کر حسین، ذہین و مخلص تھوڑی ہوگی وہ تو مجھے چاہتی بھی ہے۔ وہ کسی طرح مغرور تھوڑی ہی ہے۔ نیچے آ کر صحن کی چہار دیواری سے لگی کرسی پر براجمان ہوگیا ــــــ

آج کا دن بھی یوں ہی گزر جائے گا (میں نے سوچا) کالج کی چھٹی یوں ہی گنوا دی اب دو دنوں کے بعد کالج بھی کھل جائے گا ــــــ ناگہانی میرے ذہن نے ہچکولے لیے اور ماضی کے نشیب و فراز کے اوپر سے سانپ کی مانند رینگنے لگا۔

جب میں نے فرسٹ ڈویژن سے میٹرک پاس کیا، میرے سامنے بھی ہر ہندوستانی نوجوان کی طرح ایک نہایت ہی پیچیدہ معاشی مسئلہ اپنا خوفناک منہ پھاڑے کھڑا تھا..... اس وقت ــــــ میرے بار بار ذہن پر کافی زور دینے سے ایک دھندلا سا نقشہ ابھرا تھا۔ جس کا میری حقیقی زندگی سے عمیق تعلق تھا۔ وہ نقشہ ــــــ ایک مثلث قائم الزاویہ کا تھا۔ جس کے تین اضلاع بالترتیب تعلیم، تجارت اور ملازمت تھے۔ ان ہی تین ضلعوں میں سے کسی ایک کے سائے میں مجھے اپنی زندگی

گزارنی تھی۔ اب میرے نزدیک ان تینوں راستوں میں سے کسی ایک کو منتخب کرنا ہوگا۔ ملازمت جو اس مثلث کا قاعدہ تھا، اس سے فوری آمدنی تو ہو سکتی تھی۔ لیکن مستقبل میں ترقی و کامیابی کی کوئی کرن نہیں پھوٹ سکتی تھی۔ اس مثلث کا دوسرا ضلع یعنی اونچائی، تجارت تھا۔ یہ راہ بے انتہا بلندی پر پہنچا سکتی تھی۔ لیکن اس کے لیے سب سے بڑا مسئلہ زر کا تھا۔ لہٰذا میں نے اس خیال کو بھی رد کر دیا۔ اب میرے سامنے واحد راستہ اس مثلث کا تیسرا ضلع یعنی وِتر تعلیم تھا جس میں ترقی و کامیابی کے لامحدود دروازے کھلے تھے۔ لیکن مستقبل میں بہت ہی دھیرے دھیرے اور کافی دراز مسافت طے کرنے کے بعد ـــــ خیر اسے میری مجبوری سمجھئے یا میری پسند ـــــ میں نے اسی راہ پر چلنا زیادہ مناسب سمجھا اور کالج میں داخلہ کرالیا تھا۔

لال بابو.... بیٹا! جلدی سے آکر ناشتہ کرلو، ورنہ ٹھنڈا ہوجائے گا۔ میری ماں نے آواز دی۔ میری والدہ مجھ کو بہت چاہتی تھیں۔ یہ فطری بات بھی تھی کیونکہ میں بھائیوں میں سب سے چھوٹا جو تھا۔ علاوہ ازیں فی الحال بہنیں مجھ سے چھوٹی اور بڑی بھی تھیں۔ جو تعداد میں تین تھیں۔ انھیں بھی چاہتی تھیں۔ مگر ایک انجانے خوف کے ساتھ ـــــ کیونکہ لڑکیاں اس دور میں والدین پر بھاری بوجھ جو بنی ہوئی ہیں۔ اوپر سے طرہ یہ کہ والد صاحب ریٹائر ہو چکے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے پیسے سے لے دے کر ایک مکان کے سوا کچھ نہ بنایا تھا۔ منجھلے بھائی ادھر ادھر ٹھیکہ داروں کے پاس ملازمت کرتے تھے۔ گھر کی روزی روٹی کا واحد ذریعہ بڑے بھائی کی آمدنی تھی جو کویت سے روپے کما کما کر ارسال کر رہے تھے اور اب تک اسی وجہ سے شادی بیاہ بھی نہیں کیا تھا۔

ناشتہ تناول کرنے کے بعد اٹھنے لگا تو ماں نے کہا۔ دیکھو بیٹے دل لگا کر پڑھا کرو۔ خاندان والے بھی ہمیں ہمدردی کی بجائے حرص وحسد کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ خدانہ خواستہ اگر سہیل (بڑے بھائی صاحب) کی ملازمت چھوٹ گئی اور وہاں سے واپس

کردیا گیا تو بڑی آفت ٹوٹ پڑے گی۔ سو وقت نکال کر کوئی کام کاج کرنے کی بھی کوشش کرو۔ زیادہ نہیں تو کم از کم تمہاری پڑھائی کا تو خرچ نکل جائے گا اور میں اثبات میں سر ہلاتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

والدہ نے جو کچھ کہا صحیح کہا۔ اسے میں پہلے سے ہی محسوس کرتا آیا تھا۔ اپنے کمرہ میں آکر آرام کرسی پر نیم دراز ہونے سے پہلے میں نے چائے کا گرما گرم گھونٹ لیا اور سوچنے لگا.....

دوسروں کے ٹکڑے پر کب تک پڑا رہوں گا۔ میرے ضمیر نے یکا یک مجھے جھنجھوڑ دیا۔ کم از کم تعلیم اور پاکٹ خرچ تو نکالنا ہی پڑے گا ـــــ کالج میں امتیازی نمبروں سے پاس کروں گا تو اسکالرشپ خود بخود ملے گی۔ اس طرح پڑھائی کا خرچ نکل جائے گا۔ لیکن کالج کی پڑھائی میرے لیے بہت سہل نہیں تھی۔ سو میں نے ٹیوشن پڑھنا شروع کردیا تھا۔ اب چالیس روپے ٹیوشن فیس کے کسی طرح حاصل کرنے تھے۔ میں نے دور دراز جاجا کر بچوں کو پڑھانے کی غرض سے ٹیوشن تلاش کیا ـــــ لیکن کیا بتاؤں، آج مسلم قوم کی کیا حالت ہے۔ سڑک پر نکل جایئے تو یہاں سے وہاں تک سینکڑوں بچے دھول میں اٹے نظر آئیں گے، کھیلتے ہوئے، کوئی گلی ڈنڈا، کوئی گولا ڈنڈا، کوئی گولی، کوئی غلیل، کوئی پتنگ بازی تو کوئی لٹو وغیرہ وغیرہ ..... اور بہ مشکل ان میں سے دس عدد لڑکے ملیں گے جو کسی مدرسے یا اسکول میں زیرِ تعلیم ہوں۔ یہ بہت بڑا کام ہے۔ بچوں کا اسکول میں پڑھنا اور والدین و سرپرستوں کا پڑھانا ـــــ ورنہ مجال نہیں کہ اس کے علاوہ جو کوئی پڑھ لے یا پڑھائے۔ پھر آپ ہی بتایئے مجھے ٹیوشن کہاں سے ملتا۔ کہیں کہیں ایک آدھ ملتا تو اس سے کتنے پیسے حاصل ہونے کو تھے؟

گھر میں بیٹھے بیٹھے مجھے محسوس ہوا کہ الجھن و وحشت کے عمیق دلدل میں متواتر دھنستا جارہا ہوں۔ میں نے سائیکل اٹھائی اور اپنے دوست اعجاز کے یہاں

جانے کے لیے نکل کھڑا ہوا..... دفعتاً میرے ذہن پر ایک چوٹ سی لگی جب اعجاز نے کہا، ''آج کل وہ تقریبوں میں منی بلب سجانے کا کام کررہا ہے۔''

میں وہاں سے جوبلی پارک میں آکر بیٹھ گیا اور اپنے ہم جماعتوں کی خیالی فہرست ترتیب دینے میں منہمک ہوگیا۔

ظفر: کریم سٹی میں آئی۔ کام میں ہے اور اپنے والد کی دکان ''بہار بک اسٹور'' چلانے میں ہاتھ بٹاتا ہے۔

آفتاب: کریم سٹی نائٹ کالج کے آئی۔ کام میں ہے اور لیدر مشین کا کام سیکھ رہا ہے۔

محسن: آئی۔ کام، کریم سٹی میں ہے اور مڈل ایسٹ جانے کی غرض سے ویلڈنگ کا کام سیکھ رہا ہے۔

واحد: میٹرک پاس اور گیس کٹنگ، ویلڈنگ کا کام سیکھ رہا ہے۔

کرتار: سپلیمنٹری میٹرک کا امتحان دے کر انڈسٹریئل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں کام سیکھ رہا ہے۔

شکیل: سپلیمنٹری میٹرک کا امتحان دے کر ٹیلرنگ کا کام سیکھ رہا ہے۔

شکیل: میٹرک فیل ہے اور ٹیسکو میں مزدوری کررہا ہے۔ اور اب تو اعجاز بھی آئی۔ کام میں ہونے کے باوجود منی بلب سجانے کا کام کررہا ہے۔ صرف اور صرف میں ہی ایسا ہوں جو بے کارو بے روزگار ہوں۔ میں سائنس پڑھ رہا ہوں اور نائٹ کالج اس کے لیے غیر مناسب تھا۔ لہٰذا میں کوآپریٹیو کالج میں تھا جہاں دن میں پڑھائی ہوتی تھی۔ لہٰذا میرے لیے کوئی کام سیکھنا مشکل اور دشوار تھا۔ پس شام کے وقت ٹیوشن پڑھانے کے سوا کوئی کام کروں، ممکن نہیں تھا۔ مجھے یہاں بھی سکون میسر نہیں آیا۔ پیلی پیلی دھوپ ہر شے پہ چھائی ہوئی تھی۔ گلاب باغ کے تمام پھولوں پہ مردنی سی طاری تھی۔ دھیرے دھیرے ہوا چل رہی تھی۔ سائے میں خنکی محسوس ہوتی

اور دھوپ میں معمولی گرمی ـــــــ عجیب دن تھے۔

میں گھر واپس آ کر دوپہر کا طعام تناول کرنے کے بعد لیٹ گیا۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ڈی۔ ایم۔ ایم۔ لائبریری گیا۔ وہاں میز پر ایک اخبار پڑا تھا لیکن اسے پڑھنے کی بجائے میں ان ..... دو اجنبیوں کی باتیں سننے لگا، جو سامنے میز پر براجمان تھے۔ تم پڑھاتے ہو یہ بھی معاشی کام ہے۔ میں کہانی لکھتا ہوں، اگر یہ شائع ہو جائیں تو معاشی ورنہ ردّی اور غیر معاشی۔ کچھ لوگ پروڈکشن کرتے ہیں۔ کچھ لوگ انہی اشیا کا ردّ و بدل، رسل و رسائل، درآمد برآمد کر کے زر کماتے ہیں۔ اس طرح ہر شخص کو کچھ نہ کچھ معاشی کام کرنا ہی چاہیے ورنہ جینا مشکل اور دوبھر ہو جائے .....

واقعی مجھے بھی کوئی کام کرنا چاہیے (میں نے سوچا) کیوں نہیں منی بلب ہی کا، اعجاز کے ہمراہ ساجھا میں کام کروں، وقت کم، محنت بھی کم، معمولی ہنر سے بھی کام چل جائے گا اور آمدنی اچھی ہے۔ اسی وقت گھڑیال نے چھ بجے شام کا گھنٹہ بجایا۔

پھر میں اعجاز کے یہاں پہنچا۔ معلوم ہوا وہ ابھی نہیں آیا ہے۔ میں مایوس ہو گیا لیکن ایک انجانے جذبہ سے مغلوب ہو کر خوش خوش لوٹ کر گھر آ گیا۔

آسمان میں مکمل تاریکی چھا چکی تھی۔ جلتے بجھتے اور جھلملاتے ہوئے تارے اپنی روشنی بکھیر رہے تھے۔ شب نم ہوتی جا رہی تھی۔ میں میز پر بکھری ہوئی کتابوں میں سے ایک کو اٹھا کر پڑھنے لگا۔ یہ فزکس کی کتاب تھی میں نے نیوٹن کا کلیہ پڑھا ہی تھا کہ باہر سے کسی نے آواز دی۔

"اسلام علیکم! ماسٹر صاحب" میں نے قدرے تعظیم سے کہا۔

"وعلیکم السلام!"

یہ میرے پرائیوٹ ٹیچر تھے۔ ان کی طرح بہت کم ہی انسان محنتی ہوتے ہیں۔

ایک دفعہ تو ایسا ہوا کہ اسکولوں میں امتحان کا زمانہ تھا اور ان ہی دنوں انھیں تجارت کا مال لانے کے لیے کولکتہ جانا نہایت ضروری ہوگیا۔ ایسی حالت میں انھوں نے مجھے اپنے ٹیوشن کے بچوں کو پڑھانے کے لیے کہا تھا۔ میں نے ان کی پریشانی بانٹنے کی خاطر، ان کی اس پیش کش کو بہ شرف قبول کرلیا اور کئی دنوں تک پڑھاتا رہا تھا۔

''ان دنوں کیا کررہے ہو؟''

''یوں ہی دن گزار رہا ہوں ..... سوچ رہا ہوں کہ کہیں کام دھام .....

دفعتاً انھوں نے میری بات منقطع کرتے ہوئے کہا، ''دیکھو کام دھام تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو علم و ہنر رکھتے ہیں ان کے پاس کام کے خود سر تسلیم خم ہوجاتے ہیں شاید تمھیں معلوم ہوگا۔ میں نے گورنمنٹ سے کوٹیج انڈسٹری کے لیے قرض کے لیے درخواست کی تھی وہ منظور ہوگیا ہے۔ چنانچہ، میں دوچار دنوں کے اندر دلّی روانہ ہوجاؤں گا۔ سو تو تمھارے پاس یہ امید لے کر آیا ہوں کہ تم ہمارے ٹیوشن کے لڑکوں کو پڑھا دیا کروگے۔ تو ان کا بھی مستقبل ٹھکانے لگے گا اور تمھیں بھی افادیت ہوگی ــــــ تقریباً دس بارہ لڑکے ہیں جن سے دوسوا دوسو روپے ماہانہ مل جائیں گے۔''

یہ سن کر میری آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ شاید کام ملنے کی وجہ سے ہی روشن ہوا ٹھیں تھیں ــــــ کام ہی روشنی ہے ــــــ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ خدا بڑا کارساز ہے۔

شکریہ !!!

میرے متبسم ہونٹ مارے خوشی اور فرطِ مسرت سے اس سے زیادہ نہ کہہ سکے؟ اور نظریں تعظیم سے جھک گئیں۔

۳۱

رنگِ اضطراب

کل مدن کے فلسفے کا آخری امتحان ہونے والا تھا۔

وہ اپنے تمام تر توجہات کو سمیٹ کر اوراق میں گم تھا۔ خط و قلم بے ترتیبی سے بڑھ گئے تھے۔ زلفیں بکھری ہوئی تھیں۔ آنکھوں کے گرد حالہ نمایاں ہوگئے تھے اور دونوں گال جوفی شکل اختیار کر چکے تھے۔ دیوار سے پیٹھ ٹکائے وہ اپنی آغوش میں ایک موٹی سی کتاب لیے شام ہی سے مطالعہ میں غرق تھا۔

دفعتاً ایک زوردار نسوانی قہقہہ کی آواز فضا میں اُبھری اور دور تک رینگتی چلی گئی... اُسے لگا جیسے کسی نے عمیق اور پر سکون سطحِ آب پر پتلی قاش کا بھاری پتھر پھینک دیا ہو۔ ایک جھٹکے سے اس نے کھلی کتاب بند کردی۔

اس کے ذہن کے سمندر میں اضطراب اور بے چینی کا ایک طوفان بپا ہوگیا۔ یہ اس کی بھابھی شاردا کے ہنسنے کی آواز تھی۔ جب سے وہ اس گھر میں آئی تھی اسے ایک دن بھی سکون کا نصیب نہیں ہوا تھا۔ منجھلے دیور سے خوب پٹتی تھی اور وہ دن دن بھر ہنسی مذاق کرتے نہیں تھکتے تھے۔ اس نے صرف ایک بار بھابھی کو قریب سے

دیکھا تھا وہ بھی بڑے بھائی صاحب کے کافی اصرار کرنے پر۔ لیکن کچھ اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ ذرا سا اپنا پاؤں ہلاتی تو چھم سے آواز آتی اور کان کھڑے ہوجاتے، وہ ذرا سا اپنا ہاتھ ہلاتی تو کھن سے آواز ہوتی اور نگاہ اس طرف اٹھ جاتی۔ اسے یہ لایعنی آوازیں کچھ اچھی نہیں لگی تھیں۔

اس نے آج آخری باب پڑھنے کا پہلے ہی سے ارادہ کر رکھا تھا۔ اس نے بڑے توقف کے بعد کتاب کھولی۔ ابھی سطروں پر نگاہیں جمی ہی تھیں کہ پھر دونوں کے ہنسنے کی آواز آئی۔ وہ دونوں شاید آنگن میں بیلے اور موتیے کی کیاریوں کے پاس کھڑے تھے۔

اس نے کتاب بند کرلی۔

بے چینی اور اضطراب بڑھتا جارہا تھا۔

گزشتہ کئی دنوں سے اس کا سکون چھنتا جارہا تھا۔ اسے اس بات کا شدید احساس تھا۔

شروع شروع میں کارخانے کی دھڑام دھڑام کی آواز اور رات گئے تک سڑکوں پر چلتے ہوئے بھاری مال سے لدے ٹرکوں کی آواز ہی اسے کھلتی تھی لیکن اب تو ذرا ذرا سی بات اس کی راتوں کی نیند اڑانے لگی تھی۔ اس نے ماہرین نفسیات سے رابطہ قائم کیا تو معلوم ہوا قابوس نہیں۔ ورنہ اسے پورا شک بلکہ یقین ہو چلا تھا کہ قابوس نے اس کی نیند پر پہرہ بٹھا دیا ہے۔

وہ شام کے وقت لائبریری جاتا تو بس میں لدے پھندے لوگوں کی بھیڑ میں اسے متلی معلوم ہونے لگتی۔ ریڈنگ روم میں پڑھتے پڑھتے یکا یک کوئی اپنی کرسی کھینچتا، باہم گفتگو کرتا یا کوئی چیز گر جاتی اور اس کے ہاتھ سے سکون کا پنچھی اُڑ جاتا۔ اکثر وہ لائبریری سے بے چینی اور بیکلی کے ساتھ باہر نکلا تھا۔ راستے میں کالج کے ساتھیوں سے ملاقات ہوتی تو ان کی بیکارِ محض لفاظی اور بے تکی باتوں سے اس کے دل و دماغ لہولہان ہوجاتے۔ سکون و اطمینان مجروح ہوجاتے اور وہ گھنٹوں ان

آوازوں کی جال سے خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کرتا رہتا۔

وہ کچھ دنوں سے بازار جانے کے نام سے کترانے لگا تھا۔

بازار، سبزی منڈی، چائے خانہ، اُف! توبہ۔ شور وغل، شہد کی مکھیوں جیسی بھنبھناہٹ اور چیخ و پکار میں وہ دم بھر کے لیے کھو کر رہ جاتا۔ اسے لگتا گویا دنیا تیزی سے آگے بھاگ رہی ہو، اس تیز روی کے سامنے وہ خود کو ساکت محسوس کرتا جیسے اس کا تمام وجود منجمد ہو کر رہ گیا ہو۔ وہ اشیائے ضروری کو کسی قدر جلد سے جلد خرید کر بھاگ آنا چاہتا۔ بہت سی چیزیں پوری نہیں خرید پاتا گویا بازار نہ ہو کوئی پاگل، کوئی وحشی دیوانہ، کوئی کتا ہو جو اسے کاٹ کھانے کو دوڑ رہا ہو۔ وہ سر پر پاؤں رکھ کر کسی لٹے ہوئے مہاجر کی طرح وہاں سے بھاگ آتا۔

وہ سڑکوں پر چلتا، ٹریفک کی شور شرابا میں کان پڑی ایک آواز سنائی نہیں دیتی۔ ہارن، بھونپو اور گھنٹی کی آواز کے متواتر یلغار سے اس کا مغز خون خون ہو جاتا۔ وہ جلد سے جلد درمیانی فاصلہ طے کر لینے کی کوشش کرنے لگتا گو عقب سے کوئی سیلاب آرہا ہو جو اسے ڈبو دے گا۔ کوئی طوفان بڑھ کر اسے اپنی زد میں لے لے گا۔ وہ ہانپتے ہانپتے کسی گھنے درخت کی چھاؤں میں پناہ ڈھونڈ لیتا۔ لیکن اس کے نصیب میں چین کہاں! سکون کہاں!! لوگوں کا ایک جم غفیر ہوتا جو بھاگتا ہوا نظر آتا۔ اسے دیکھ کر اسے وحشت ہونے لگتی اور لمحوں میں سکون چھن جاتا۔

آخر کار اس نے تمام باتوں کو ذہن سے جھٹک دیا اور فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر حلق میں غٹ غٹ اتار لیا۔ قدرے اطمینان ہوا تو کتاب کھول کر پوری یکسوئی کے ساتھ پڑھنے لگا۔ لیکن یہ کیا ــــــــ؟ ابھی نصف پیراگراف ہی پڑھ پایا تھا کہ اس کے دھوئیں پانی کے شریک نے ریڈیو پر خبریں سننا شروع کر دی۔ اس نے جھلّا کر ایک بار پھر اپنی کتاب بند کر لی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہا ہو، اس کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ وہ غصے سے

کانپنے لگا۔ لیکن وہ کر بھی کیا سکتا تھا؟ اس نے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا۔

"کیسے واہیات لوگوں کی یہ بستی ہے۔
ان کا نفس شیاطین کا غلام ہو چکا ہے۔
ہنگامہ پسند روح کے مالک!
مردہ ضمیر کہیں کے!!"

وہ اٹھا اور اٹھ کر چاروں کھڑکی اور دروازے بند کر کے واپس آیا اور پلنگ پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر لیٹ گیا۔ اس نے کتاب کھول کر اپنے سینے پر الٹ کر رکھ لی اور اس کے بعد وہ کسی سوچ میں غرق ہوگیا۔ بی بی سی لندن سے دھیمی دھیمی آوازیں اب بھی آرہی تھیں۔

اچانک اسے لگا جیسے اس کے سر پر آہستہ آہستہ آری چل رہی ہے۔ تبھی اس نے مضطرب ہو کر دونوں آنکھیں کھول دیں۔ پنکھا اب بھی بدستور سر کے اوپر چل رہا تھا۔ اس نے بڑی اضطرابی سے ہاتھ بڑھا کر پنکھے کا سوئچ آف کر دیا۔

لیکن آج اسے پہلی دفعہ اتنی شدت سے احساس ہوا کہ ٹیبل پر رکھی گھڑی کی ٹک ٹک، گھڑی کی ٹک ٹک کی آواز نہ ہو بلکہ کوئی ننھے ننھے دو شیطانی ہاتھ ہیں جو اس کے مغز میں مسلسل سوئیاں چبھا رہے ہیں۔ یا کسی عنکبوت کا جال ہے جو متواتر اس کے وجود کو اپنے گھیرے میں لے رہا ہو۔ اس خیال نے اُسے بے چین کر دیا۔

تبھی اس نے ایک جھٹکے سے بڑھ کر گھڑی بند کر دی۔

آج وہ ہر طبیعی آواز کی بار سے سبک دوش ہو جانا چاہتا تھا۔ وہ اپنے گرد بنتی ہوئی آواز کے ہر جال کو کاٹ کر قطعی آزاد ہو جانا چاہ رہا تھا۔ وہ سکون کا متلاشی تھا، مکمل سکون!! خاموشی!!

حیات انسانی گوناگوں آرزوؤں کی آماجگاہ ہے۔ لیکن اس کی صرف ایک آرزو تھی، اس کی زندگی صرف ایک آرزو کے محور پر گردش کر رہی تھی۔

سکون،
قلبی سکون!
ذہنی سکون!
مکمل سکون!!

وہ بچپن سے ہی کم گو تھا۔ خاموشی اور تنہائی اسے بے حد پسند تھی۔ وہ پہاڑ، جنگل، گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اسے ساحل پر پہروں خاموشی سے بیٹھ کر چھوٹی سنہری مچھلیوں کے شکار کرنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ شام کے وقت وہ ساحل کنارے بیٹھا پرسکون سمندر کو دیکھا کرتا تھا۔ کئی بار اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ وہ سمندر سے اپنے لیے تھوڑی سی خاموشی مانگ لے، تھوڑا سا سکون حاصل کر لے۔ سوچتے سوچتے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ سوچنے لگا سمندر نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ وقت نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ کاش! اس کے حصے میں بھی سکون ہوتا، اس کی سسکیاں تھم گئی تھیں۔

ریڈیو کی آواز تیز ہوگئی تھی۔ ناگہانی اس کی بے چینی پھر بڑھ گئی۔

بلب کی روشنی آنکھوں میں چبھنے لگی۔ بے قراری بڑھتی جا رہی تھی... وہ یکلخت اٹھا اور بتی گل کرنے کے بعد اپنی بانہوں میں منھ ڈال کر دونوں پاؤں سکوڑے بیچ پلنگ پر بیٹھ گیا۔

ناگہانی کچھ ہی فاصلہ پر قائم انڈین کاسٹنگ کمپنی سے متواتر سائرن کی آواز ساکت فضا کا سینہ چھلنی کرنے لگی۔ شاید کوئی حادثہ پیش آگیا ہوگا۔ اسی دم اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ گو اُسے کوئی تاریک کھنڈر میں چاروں طرف سے ڈھکیل رہا ہو اور ہر بار وہ بے سہارا ہو کر لڑھکتا جا رہا ہے۔ دفعتاً وہ کھڑا ہو گیا اور کمرہ کے اندر چاروں طرف مضطربانہ ٹہلنے لگا۔

سائرن کی آوازیں تھمنے لگی تھیں۔

ریڈیو کی آواز تیز ہوگئی تھی۔ ناگہانی اس کی بے چینی پھر بڑھ گئی ـــــــ

وہ خود کو پسینہ میں شرابور دیکھ کر حیران ہوگیا۔

فضا مکدر ہوتی جارہی تھی۔ ماحول میں گھٹن سرایت کرتی جارہی تھی۔ معاناً اُسے نشیب سے کمرہ حبس ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

وہ تنہائی کا متلاشی تھا۔ اسے کھلی فضا کی ضرورت تھی۔ صاف اور شفاف فضا کی، تنہائی اور خاموشی کی ـــــــ

وہ کمرہ سے باہر نکل کر بھاگنے لگا۔ وہ بھاگ رہا تھا۔ دیوانہ وار بھاگ رہا تھا۔ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہا تھا۔ کھیتوں اور پگڈنڈیوں کو لانگتا ہوا بھاگ رہا تھا۔ چٹانوں کو پھلانگتا ہوا بھاگ رہا تھا۔

وہ مسلسل بھاگ رہا تھا۔

اور وہ جتنی تیزی سے بھاگ رہا تھا، اتنی ہی تیزی سے آوازیں اس کا تعاقب کررہی تھیں۔ حتیٰ کہ وہ بغیر کہیں دم لیے پہاڑ کی اونچائیوں پر چڑھنے لگا۔ چڑھتے چڑھتے اس کے دونوں پاؤں لہو لہان ہوگئے۔ لیکن وہ ان سب سے بے پرواہ چڑھانوں پر چڑھتا ہی جارہا تھا ـــــــ وہ تو خاموشی کا طالب تھا۔ سکون کا متلاشی۔

سکون، ـــــــ

قلبی سکون!

ذہنی سکون!

مکمل سکون!!

لیکن ـــــــ سکون کہاں؟

پہاڑ کی بلندیوں پر گرم اور تیز ہوا کی سائیں سائیں نے اس کے پس ماندہ سکون کو جلاکر خاکستر کردیا۔ شاید نزدیک ہی کہیں پورب کی طرف سوکھے بانسوں کے رگڑ کھانے سے آگ لگ گئی تھی۔ تیز ہواؤں کی حدت نے اس کے وجود کو ایک دم

جھلس کے رکھ دیا ـــــــ

وہ غار کی طرف بھاگنے لگا۔

شاید وہاں امان ملے،

سکون ملے،

خاموشی ہو ـــــــ

لیکن ـــــــ خاموشی کہاں میسّر تھی؟

خالقِ کائنات نے تو ازل سے ہی بنی نوع انسان کے نقشِ اوّل میں اضطراب کا رنگ بھر دیا تھا۔ بے قراریاں اور ہنگامہ آرائیاں ہی زندگی کی علامتیں ہیں۔

لیکن اس پر تو ایک عجیب وغریب جنونی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔

وہ تو اس بلندی پر پہنچ چکا تھا، جہاں ہر طرح کے خوف و ہراس پیچھے چھوٹ جاتے ہیں، بہت پیچھے ـــــــ جہاں سے ہر شے چھوٹی دکھائی دینے لگتی ہے۔ آج وہ آخری بلندی چھو لینا چاہتا تھا۔

جلد ہی وہ ایک اندھے غار میں داخل ہو گیا

لیکن ـــــــ یہ کیا؟

وہاں بھی پناہ نہیں، وہاں بھی امان نہیں، خاموشی نہیں، سکون نہیں، اب سکون کہاں ملے گا؟

خود اس کے وجود سے صدائیں باہر آنے لگیں۔ غار کی کھوکھلی دیواروں سے صدائیں بازگشت کرنے لگیں۔ چاروں طرف ایک ہی آواز ـــــــ

دھک دھک ...

دھک دھک ... دھک دھک ... دھک دھک ... دھک دھک ...

اس نے انتہائی جنون میں آکر ایک نوکیلا پتھر اٹھایا اور دل کا نشانہ بنا کر اپنے سینے میں پوری طاقت سے گھونپ دیا۔

نقاب پوش بے نقاب

ندیم سا نچی بس اسٹینڈ میں الیکٹرک پول کے نزدیک بیٹھا تھا۔ دفعتاً اس کی نگاہ گھڑی پر گئی وہ پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ اف! پورے چار بج گئے مگر اب تک طلعت کا پتہ نہیں اتنا کہہ کر وہ رخصت ہونا ہی چاہتا تھا کہ کچھ فاصلے پر ایک نقاب پوش آتا نظر آیا۔ لیکن دوسری جانب سے بھی ایک نقاب پوش آتا دکھائی پڑا۔ یہ دیکھ کر وہ کچھ لمحے کے لیے چکرایا مگر فوراً ہی ایک کے ہاتھ میں تازہ گلاب کا پھول دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ یہ ہی طلعت ہے۔ لیکن اب بھی اسے نصف یقین تھا، اس نے شک دور کرنے کی غرض سے کہا، ''طلعت، اتنی دیر کردی تم نے، چلو جلدی چلو''، کہتا ہوا وہ آگے بڑھا۔ کچھ دور جانے کے بعد جب اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ دونوں نقاب پوش اس کے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ اس نے ایک ہی نظر میں اندازہ لگالیا۔ یہ طلعت جیسی کوئی نوخیز دوشیزہ نہیں بلکہ درمیانی قد و جسامت کی عورتیں ہیں۔ لیکن ایک کے ہاتھ میں گلاب کا پھول بھی تو ہے، یہ طلعت کے ماسوا کون ہوسکتا ہے؟ کچھ دیر بعد جب گارڈن ریچ کا آدھا راستہ طے ہوگیا تب اس نے

پھر گھوم کر دیکھا۔ اس مرتبہ اس کی پریشانی مزید بڑھ گئی، واقعی ایک کے ہاتھ میں سرخ، تازہ گلاب کا پھول بھی تھا۔ وہ اب تک اسی اُدھیڑ بُن میں تھا کہ گارڈن ریچ آگیا۔ اب ان لوگوں کو جانچنے کا پھر ایک موقع ہاتھ آیا تھا۔ اس نے بڑی چالاکی سے کام لیا۔ وہاں وہ اور اس کی عزیز معشوقہ اکثر بیٹھا کرتے تھے، وہاں نہ بیٹھ کر ندیم انھیں بچوں کے پارک میں لے گیا۔ بچوں کے پارک میں وہ تینوں پہنچ کر کھڑے تھے۔ ندیم ان نقاب پوشوں سے کچھ دور ہٹتا ہوا، خلاف معمول، تحکمانہ انداز میں بولا۔

''مس طلعت، پلیز سٹ ڈاؤن۔'' ندیم سر جھکائے کنکھیوں سے دیکھتا رہا کہ وہ بیٹھتے ہیں یا نہیں؟

جب کچھ دیر تک ان میں سے کوئی نہیں بیٹھا تو وہ سمجھ گیا کہ ان میں سے کوئی بھی اس کی اپنی طلعت نہیں ہے۔ وہ دونوں نقاب پوش ویسے ہی کھڑے تھے جیسے انھیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ وہ بوریت کے جذبہ سے بے نیاز ہوکر جلدی سے بولا۔

''طلعت صاحبہ! آپ بیٹھیے۔'' وہ انھیں بھانپتا رہا۔

اس بار دونوں نقاب پوشوں میں کچھ حرکت سی ہوئی۔ اس سے وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ ان میں کوئی بھی انگریزی زبان سے واقف نہیں ہے۔ اگر طلعت ہوتی تو ایک تو اسے انگریزی سمجھتے دیر نہ لگتی، دوسری بات یہ کہ وہ گارڈن پہنچتے ہی نقاب اٹھا کر میرے بانہوں میں جھول جاتی۔

ادھر وہ دونوں بظاہر ایک دوسرے کو نقاب کی باریک جالی سے بغور دیکھ رہے تھے۔ مگر اصل میں ان میں سے ایک اس خیال میں غرق تھا کہ طلعت کا ماموں تو کہتا تھا کہ طلعت بس اسٹینڈ سے اندھی پھول والی کے یہاں سے روزانہ ایک سرخ رنگ کا تازہ گلاب کا پھول لے کر جاتی ہے۔ ندیم اس کا منتظر رہتا ہے۔ دونوں جب ملتے ہیں تو خاموشی سے گارڈن ریچ پہنچ جاتے ہیں۔ دونوں گارڈن میں گلاب باغ

کے نزدیک جاتے ہیں۔ اس وقت خود طلعت چہرے سے برقعہ نکال کر اپنا چاند سا مکھڑا اس کے سینے سے لگاتی ہے اور بانہوں میں اس کے جھول سی جاتی ہے، مگر یہ سب کچھ میں کیسے کروں؟ لڑکا تو وہی ندیم معلوم ہوتا ہے۔ اس کے تمام نشانات بھی ملتے جلتے ہیں۔ اس کے ماموں نے بتایا تھا مگر اس کے ساتھ یہ عورت کون ہے؟ یہ اتنی بھاری جسم کی عورت کبھی طلعت تو نہیں ہوسکتی ہے؟ پھر اسے تو بذات خود میں اس کی خالہ کے پاس چھوڑ آئی ہوں۔ اسی کش مکش میں پہلا نقاب پوش نہ جانے کیا کیا سوچ رہا تھا.....

دوسرا نقاب پوش اس تاک میں تھا کہ یہ کمبخت اس کے بانہوں میں اپنے کو سمائے، کب یہ اس کے سینے سے لگے کہ میں اس کی چوٹی پکڑوں اور ..... اور .... وہ گھما گھما کر پھینکوں کہ زندگی بھر چڑیل یاد رکھے۔ نہ جانے کیسے کیسے والدین ہیں اس دنیا میں کہ جن جن کر چھوڑ دیتے ہیں ان چڑیلوں کو تاکہ وہ دوسروں کے اچھے خاصے بیٹوں کو خراب کرتی پھریں، بہکائیں اور والدین کی باتیں نہ سننے دیں۔ مگر یہ کیا وہ برقعہ پوش تو سیدھا کھڑا ہی ہے۔ ندیم کا بھتیجا تو کہتا تھا کہ یہ لوگ گارڈن پہنچ کر گلاب باغ میں خوب گل چھرے اڑاتے ہیں لیکن یہاں تو صرف ایک ہی گلاب ہے جو اس کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے ساتھ اس کے چچا نے یہ بھی تو کہا تھا کہ ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے، ہنستے گاتے، مدہوش نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ برقعہ پوش کمبخت، ایسا کیوں نہیں کر رہی ہے۔ وہ نقاب پوش غصہ میں آگیا اور نہ جانے کیا کیا سوچتا ہی رہا.....

اب تک ندیم کھڑا دیکھتا رہا تھا۔ وہ دونوں نقاب پوش پتھر کی مورت بنے کھڑے تھے۔ وہ سوچنے لگا کہیں یہ دونوں ہمارے دشمن تو نہیں ..... وہ سوچنے لگا کہیں یہ ہمارے اور طلعت کے درمیان بلیک میلنگ تو نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ یکا یک اس کے اس قیاس کا نشہ ٹوٹا، نظر گھڑی پر پڑی۔ وہ متحیر رہ گیا..." ارے ساڑھے چار

ہو گئے۔'' گھڑی کے ایک گوشہ میں Sunday دیکھ کر اس کے کانوں میں طلعت کی آواز حرف بہ حرف آنے لگیں۔ ''4/ جنوری کو اتوار کے روز کچھ کام ہے اور امّی بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتیں اس لیے میں چار کے بجائے ساڑھے چار بجے حسب معمول اس مخصوص مقام پر ملوں گی۔ اور تم انتظار کرنا تا کہ انتظار کے بعد ہماری ملاقات کی اہمیت کا صحیح لطف حاصل ہو!'' ہنستی ہوئی شوخی سے بولتی ہوئی بڑھی تھی اور دور تک ہاتھ ہلاتی جا رہی تھی..... اس نے ان دونوں کو دیکھا جو بت بنے نہ جانے کیا سوچ رہے تھے اور ان کا رخ ایک دوسرے کے جانب تھا۔ اسی اثنا موقع غنیمت جان کر وہ وہاں سے آہستہ سے کھسک گیا۔

☆☆☆

طلعت بس اسٹینڈ میں الیکٹرک پول کے نزدیک کھڑی تھی۔ اس نے گھڑی دیکھی اور نہایت عاجزی کے ساتھ کہا، ''اوف ندیم! یو آر لیٹ، چار پینتیس ہو رہے ہیں اور اب تک تمھاری خبر نہیں۔'' اتنا سوچ کر وہ رخصت ہونا ہی چاہتی تھی کہ کچھ دور سے ٹیکسی آتی نظر آئی۔ جس کے دروازے سے ایک ہاتھ ہوا میں اس طرح لہرا رہا تھا گویا اسے ہی رکنے کا اشارہ کر رہا ہو۔ وہ رک گئی، ٹیکسی رکی تو ندیم نظر آیا۔

''آؤ طلعت بیٹھو''۔ وہ دروازہ کھولتا ہوا بولا۔

''کیوں آج کوئی نیا پروگرام بنایا ہے آپ نے؟'' آگے بڑھتی ہوئی اس نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ طلعت بیٹھی اور ٹیکسی چل پڑی۔

''جانتی ہو! آج کیسی کیسی بلاؤں سے بچا ہوں؟'' ندیم نے کہا۔

''کیا مطلب..... کیسی بلاؤں سے؟'' وہ سوالیہ انداز میں بولی اور جواب طلب نگاہوں سے گھورنے لگی۔ ندیم نے لاپرواہی سے کہا، ''ارے کیا بتاؤں! ٹھیک چار بجے تمھارے انتظار کے بعد مایوس، گھر جانے کی سوچ رہا تھا کہ ایک برقعہ پوش میرے قریب آیا۔ اس کے ہاتھ میں ٹھیک تمھارے ہی جیسا گلاب کا پھول بھی تھا۔

میں نے جلد ہی پارک کی راہ اختیار کر لی۔ مگر آدھے راستے میں مڑ کے جو دیکھا تو دو نقاب پوش میرے ساتھ تھے۔ میں انھیں بچوں کے پارک میں لے گیا۔ ان کے اس وقت تک کچھ نہ کہنے پر میں سمجھ گیا کہ تم ان میں سے گلاب کا پھول لیے نقاب پوش بھی نہیں ہو، تب انھیں بیٹھنے کے لیے کہا مگر پتہ نہیں ان کا کیا ارادہ تھا۔ وہ بت بنے کھڑے کے کھڑے رہے۔ آخر میں انھیں ویسی ہی حالت میں چھوڑ کر اور اپنی جان بچا کر بھاگ آیا ہوں۔ اس نے طلعت کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھا اور جذبات کی رو میں بہتے ہوئے کہا، ''جانتی ہو میں تو سمجھ رہا تھا کہ کہیں تمھیں کوئی ہم سے چرا نہ لے جائے!'' طلعت نے اس کی جانب تبسم بکھیرتے ہوئے دیکھا اور جوش بھرے لہجہ میں کہا، ''مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے''، دوسرا مصرعہ ندیم اور طلعت دونوں نے مل کر اک ساتھ کہا، ''وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔'' اتنے میں طلعت پھر کچھ کہنے ہی والی تھی کہ ٹیکسی سنیما ہال کے قریب جا کر رکی۔ ''ارے! 'بھابھی' بدل گئی کیا؟'' ٹیکسی ڈرائیور نے جھٹ سے کہاں ہاں بابو جی کل ہی۔ طلعت نے کہا، ''تو کیا چودہویں کا چاند کوئی خراب پکچر ہے؟'' ندیم نے ٹکٹ کٹایا اور لاپرواہی سے کہا، اب تو دیکھنے کے بعد ہی معلوم ہوگا..... ہال میں داخل ہوئے تو پکچر اسٹارٹ تھی، یہ دیکھ کر ان کی نگاہیں پردے پر جم گئیں۔

ادھر اب تک یہ نقاب پوش گم صم کھڑے تھے۔ پت جھڑ کا موسم تھا۔ یکا یک ہوا کا تیز جھونکا آیا، دونوں کے چہرے پر سے نقاب ایسا اڑا کہ ایک کا غصے سے سرخ چہرہ اور دوسرے کا متحیر چہرہ صاف نظر آ گیا۔ بچے، جو اب تک انھیں گھیرے ہوئے کھڑے تھے، ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگے۔ پہلے کے ضعیف چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا ایک رنگ جا رہا تھا اور دوسرے کے 'نیم ضعیف ہاتھوں سے گلاب کا پھول اڑ کر کافی دور جا چکا تھا۔ اب تک جو نقاب لگائے ایک دوسرے کی حقیقت فاش کرنے کے لیے منتظر کھڑے تھے، بے حد پشیماں ہوئے۔ دونوں ایک ساتھ گھومے تو ندیم اپنی جگہ

سے غائب تھا۔ ندیم کی جگہ پر بچے کھڑے تمسخر کر رہے تھے۔ اب روشن آفتاب تو غروب ہو چلا تھا مگر شب کی ظلمت فضاء پر حاوی ہوتی جا رہی تھی۔ پہلا جو گلاب پھول والا نقاب پوش تھا، وہ طلعت کی ماں اور دوسرا نقاب پوش ندیم کی ماں تھی۔ دونوں نے دو، دو قدم آگے بڑھنے کے بعد مڑ کر ایک دوسرے کو دیکھا اور غائب ہو گئیں۔ مگر ظلمت نے ان لوگوں کو بھی آگے بڑھ کے دبوچ لیا تھا، دونوں کے چہرے سیاہ پڑ گئے تھے۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ بُرے کام کا انجام بھی برا ہوتا ہے۔

۳۲

یاد جاناں — ایک کسک

اکثر جب میرے محبوب کی یادوں کے پے در پے یلغار سے میرا ذہن چوُر چوُر ہوجاتا ہے، اس دم میرے اندر کا آدمی وصل محبوب کے لیے بے قرار ہو اٹھتا ہے اور پھر ناچار ہوکر کراہنے لگتا ہے۔ ان حسین یادوں کا طویل سلسلہ بیشتر اسی وقت شروع ہوتا ہے جب کوئی اچانک واقعہ پیش آجائے یا پھر کوئی دلکش حادثہ سرزد ہوجائے۔ تب میں تنہائیوں، اندھیروں اور کھلی فضاؤں کو زیادہ فوقیت دیتا ہوں۔ ایسے میں پہروں بیٹھ کر میں اپنی خاموش نگاہوں سے خلاؤں کو گھورتا رہتا ہوں۔ آسمانوں سے پوچھتا ہوں اور آکاش پر بکھرے ہوئے ان گنت ستاروں سے باتیں کرتا ہوں۔

ہاں آج بھی برسوں بعد میرے ساتھ کچھ ایسا ہی حادثہ پیش آیا تھا۔ آج میرے دل نے اپنے محبوب کو دیکھا تھا۔ وہ ویسا ہی ہے جیسا آج سے سات سال قبل تھا۔ دراصل، میری اس آخری ملاقات کو گزرے سات سال بیت چکے ہیں۔ میرے دل نے اس کی جان لیوا ادا پر جملہ تحسین ادا کردیا——نہ بزرگوں کا پاس تھا نہ ہی محفل کا خیال، بس پھر کیا تھا میرا محبوب حسب معمول اپنی بڑی بڑی اور جھیل جیسی عمیق لیکن پرشکوہ

نگاہوں سے مجھے گھورنے لگا۔ دفعتاً اس کے ہونٹوں کے شگوفہ ہائے چیخ چیخ گئے اور میں حیرت میں غرق ہوگیا کہ اب بھی وہی ظالم ادا باقی ہے۔ کھلی پلک میں جھوٹا غصہ بند پلک میں پیار لیکن ہونٹوں پر انکار کے ساتھ ہی ساتھ آنکھوں سے اقرار کی جھلک بھی صاف نمایاں تھی۔ یکا یک آنکھ کھلی تو دیکھا کہ صبح صادق کا وقت تھا اور اللہ اکبر کی آواز کانوں میں رس گھول رہی تھی۔ آواز میرے پردۂ سماعت سے ٹکرائی اور پھر شفق سے پو پھوٹنے لگی تھی۔

پھر اس خواب کے حسین یاد کے شعلوں میں لپٹا موسم گرما کے طویل دن میں کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کی تپش محسوس کرتا رہا۔ شام رنگین ہوئی اور رات کی سیاہ آغوش میں مدہوش ہوکر روپوش ہوگئی۔ میں سبزہ زار کے نرم بستر پر اپنے بازوؤں کا تکیہ لگائے کھلی فضا میں وسیع آسمان تلے پڑا، اس کے وصل کے حسین لمس کو محسوس کررہا ہوں۔ اسی وقت میری خاموش نگاہوں کی لب کشائی ہوئی اور وہ بول پڑتی ہیں۔

اے آسمان کے ننھے ننھے روشن ستارو! کیا تمھیں معلوم ہے میرا محبوب کہاں ہے؟ سنا ہے کبوتر کی نظریں بہت تیز ہوتی ہیں۔ تم بھی تو مثل کبوتر چھوٹی چھوٹی چمکیلی آنکھیں رکھتے ہو کہ تم تو سراپا ننھے سے ہو۔ تمھاری نگاہیں تو کبوتروں سے بھی زائد تیز ہوں گی۔ تم ذرا مجھ پر احسان کرو۔ میری ناخدائی کرو۔ میرے ناخدا بن جاؤ۔ تمھارا احسان میں تاقیامت نہیں بھولوں گا۔ تم میرے محبوب کو ڈھونڈ لاؤ۔ کیا تم اسے نہیں پہچانتے؟ نہیں! نہیں! تم اسے ضرور جانتے ہوگے جیسا کہ ہم زمین والے تم لوگوں کی شکل وصورت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ دیکھو میں عطارد کو جانتا ہوں۔ میں زحل کو جانتا ہوں میں مشتری کو جانتا ہوں ... غرض کہ تم آسمان والوں کی شکل وصورت سے جب ہم واقف ہیں تو بھلا تم لوگ کیا ہماری خبر نہیں رکھتے ہوگے ــــــ بھلا قطب تارہ کو کون نہیں جانتا۔ ہمارے یہاں کا بچہ بچہ اس تارا

کی شکل و صورت اور اسم و مقام سے واقف ہے۔ تو پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ میرے محبوب کو تم نہیں جانتے ہو گے۔ نہیں۔ نہیں۔ بلاشبہ تم اسے ضرور جانتے ہو گے۔ وہ ہماری زمین کا مثل قطب تارا ہے۔ بلکہ قطب تارا کی روشنی بھی اس کے چہرۂ پُر نور کے آگے شاید ماند پڑ جائے۔ اس کی شخصیت کہکشاں کی طرح تاباں ہے۔ اس کا جسم چاندی سا ہے۔ اس کے رنگ چاند سے زیادہ درخشاں ہیں۔ اس کے ہونٹوں کا شہد جیسا ذائقہ ہے جس پر لعل جڑے ہوئے ہیں۔ اس کی آنکھیں جھیل جیسی عمیق اور ستاروں جیسی روشن ہیں۔ اس کے رخساروں پر شفق جیسی سرخی ہے۔ اس کی طویل و پُرخم زلف پریشاں گھٹاؤں سے زیادہ حسین اور شب کی تاریکیوں سے زیادہ سیاہ ہیں۔ اس کے خوبصورت دہن میں موتی کے دانت جڑے ہوئے ہیں۔ اس کے مرمریں ہاتھوں میں ماہر فن کی نقاشی کی ہوئی ہے۔ اس کی ہتھیلی سونے کی ہے جس پر سرخ حنائی رنگ ایسا لگتا ہے گویا مشرق سے سورج اپنا سر بلند کر رہا ہو۔ وہ اپنی محفل میں سب سے نمایاں ہے۔ خندہ پیشانی اونچا قد ہے۔ میرا محبوب حوروں کا حور ہے۔ میرا محبوب سراپا نور ہے۔ میرا محبوب قدرت کا عظیم شاہکار ہے۔ نازش زمین ہے میرا محبوب عظیم ہے۔

وہ دنیا کے عظیم ڈرامہ نگار شیکسپیئر کی ہیروئنوں سے زیادہ شکیل اور جمیل ہے۔ وہ مونالیزا سے زیادہ حسین ہے۔ وہ پورشیا سے زیادہ ذہین و حاضر جواب اور رنگین شخصیت کی ملکہ ہے۔ وہ اس دھرتی کے معزز اور اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہے وہ اگر آفتاب ہے تو آفتاب اس کے نزدیک حقیر ذرہ سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کا جسم توانا ہے اور گداز ہے۔ اس کے جوان جسم کی خوشبو مٹی سے زیادہ سوندھی ہے، مشک سے زیادہ شیریں ہے اور زعفران سے زیادہ لطیف ہے۔

اس کا پوشاک سمندر اور آسمان جیسا نیلا فام ہوتا ہے۔ چاند اور برفیلے پہاڑوں سے زیادہ سفید ہوتا ہے۔ اگتے سورج کی طرح سرخ اور شاداب پہاڑوں کی طرح

سبز ہوتا ہے۔ اس کے آنچل میں سلمیٰ و ستارے ٹکے ہوئے ہوتے ہیں۔ ننھے ننھے ستاروں کی روشنی مجھے تسلی دیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ان کا جگ مگ جگ مگ کرنا ایسا لگتا ہے کوئی مجھے تھپکی دے رہا ہو۔ میرے دل پر ہاتھ رکھ رہا ہو اور کہہ رہا ہو ''میں ضرور تلاش کروں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں تیرے محبوب کو ضرور تلاش کروں گا۔''

اس دم میری تشنہ روح کی تشنگی بجھتی ہوئی محسوس ہوئی ہے۔ تب میرے اندر سے آواز آتی ہے کل میں پھر ملوں گا اسی جگہ تیرے انتظار میں نظریں بچھائے اور تو خوب جانتا ہے انتظار کی گھڑیاں کتنی مشکل سے کٹتی ہیں۔ تو میرے محبوب کو کل ضرور لائے گا۔ مجھے یقین ہے مجھے یقین ہے ..... اب مجھے نیند آجائے گی میں میٹھی نیند سوسکوں گا جس کے لیے برسوں سے میری آنکھیں ترستی رہی ہیں ـــــــــ لیکن ہاں وہ مل جائے تو بلا تامل مجھے جگا دینا اور اس کا پتہ مجھے بتا دینا ـــــــــ لیکن یہ یاد رہے اگر وہ سوتا رہے تو بھولے سے نہ جگانا اس کو کہ وہ میرا محبوب ہے۔ اس کی نیند میں خلل نہ ڈالنا۔ وہ ایسے ہی ایک مدت کے بعد ملا ہے ـــــــــ اگر ناراض ہوگیا تو میں کیسے جیوں گا ـــــــــ ؟ یہ یاد رہے اسے سوتے میں نہ جگانا ہرگز کہ وہ میرا محبوب ہے !!!

☆☆☆ ختم شد ☆☆☆

کتاب کا مختصر تعارف

اس افسانوی مجموعے میں تئیس افسانے شامل ہیں۔ یہ کتاب دہلی اردو اکادمی کے مالی تعاون سے اشاعت پذیر ہوئی ہے۔ اس میں علامتی، تمثیلی اور روایتی سبھی قسم کے افسانے شامل ہیں ان میں ہیئت اور تکنیک کے تجربے بھی ہوئے ہیں اور ان افسانوں میں سماج کے گوناگوں مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کے باوجود افسانہ نگار کا اسلوب ہر جگہ غالب اور منفرد نظر آتا ہے۔

اس میں کسی نوع کے انتخاب کے بجائے پرویز شہریار کے تقریباً سبھی افسانوں کو شامل کرلیا گیا ہے۔

چند اقتباسات

خالق کائنات نے تو ازل ہی سے بنی نوع انسان کے نقش اوّل میں اضطراب کا رنگ بھر دیا تھا۔ بے قراریاں اور ہنگامہ آرائیاں ہی زندگی کی اصل علامتیں ہیں۔

لیکن اس پر تو ایک عجیب وغریب جنونی کیفیت طاری ہوچکی تھی۔ وہ تو اس بلندی پر پہنچ چکا تھا، جہاں ہر طرح کے خوف وہراس پیچھے چھوٹ جاتے ہیں، بہت پیچھے۔ جہاں سے ہر شے چھوٹی دکھائی دینے لگتی ہے۔ آج وہ آخری بلندی کو چھو لینا چاہتا تھا۔

(رنگِ اضطراب)

ایک انوکھے قسم کی گدازیت کا لمس ... میں کہاں پھنس گیا؟ پھر تو خود کو میں نے پرچھائیوں کے جھرمٹ میں قطعی گھرا پایا۔ پرچھائیوں کی زلفیں میرے بازوؤں پر پریشان ہونے لگیں ... "یہ دنیا— ! ہم دل کی دنیا آباد کرتے ہیں، تم بھاگتے لمحوں میں سے کچھ حصے میرے نام کردو ... یہ ان تاریکیوں کا ازلی حق ہے۔ (سایہ سایہ جنگل)

سید پرویز احمد ولد شہاب قاضی پوری، قلمی نام پرویز شہریار، تاریخ پیدائش ۱۰؍جنوری ۱۹۶۴ء، جائے پیدائش جمشید پور، وطن قاضی پور (شاہ آباد) اور موجودہ سکونت نئی دہلی ہے۔ انھوں نے اپنی نوجوانی میں پہلا افسانہ ۱۹۸۰ء میں لکھا جب کہ وہ دسویں جماعت کے طالب علم تھے۔ یہ افسانہ فن کی کسوٹی پر بالکل کھرا اُترا اور ''پندار'' پٹنہ کے ۶؍ستمبر ۱۹۸۰ء کے شمارے میں ''چمبل کی دسویں رانی'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس طرح، آپ کے ادبی سفر کا آغاز ۱۹۸۰ء سے ہوتا ہے۔ شروع میں، جدیدیت کے رجحان سے بھی اثرات قبول کیے اور چند ایک علامتی اور تجریدی افسانے بھی لکھے۔ ''قوس'' کے ایک خصوصی شمارہ ''نیا افسانہ، کچھ نئے نام'' میں مختصر تعارف کے ساتھ ایک علامتی افسانہ ''نئی روشنی کا آخری ڈرامہ'' کے عنوان سے ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۸۶ء میں ''شب خون'' میں ''سایہ سایہ جنگل'' شائع ہوا تو شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا کہ پرویز شہریار جمشید پور کے نئے افسانہ نگار ہیں۔

اس کے بعد جلد ہی افسانے میں کہانی پن، بیانیہ اور حقیقت نگاری کی فوقیت کے ادراک اور شعور سے واپسی کہانی کی پرانی ڈگر پر ہوگئی۔ بسلسلۂ تعلیم دلّی آنے کے بعد آل انڈیا ریڈیو سے کچھ افسانے نشر ہوئے مثلاً ''پھول کا بوجھ'' اور اسی قبیل کے دیگر افسانے۔ ان کے افسانے ادبی اور نیم ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ''شاعر'' اور ''کتاب نما'' میں ان کی نظمیں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اس کے علاوہ، ہندوستان اور پاکستان کے مؤقر رسائل و جرائد مثلاً ''آجکل''، ''ایوان اردو''، ''اردو دنیا'' اور ''اخبار اردو'' وغیرہ میں ان کے علمی اور ادبی مضامین اشاعت پذیر ہوکر مقبول عام ہو چکے ہیں۔ ان کی ایک تحقیقی اور تنقیدی کتاب ''منٹو اور عصمت کے یہاں عورت کا تصور'' عنقریب منظر عام پر آرہی ہے۔

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, VAKIL STREET, KUCHA PANDIT, LAL KUAN, DELHI-6 (INDIA)
PH: 23216162, 23214465 FAX: 011-23211540
E-MAIL: ephdelhi@yahoo.com

81-8223-1168-X